

ہندستانی زبان

RNI No. MAHURD/2015/66804

شمارہ:

جنوری۔ مارچ ۲۰۱۹ء

سال: ۵

2	ہماری بات	مُدیرو اعلیٰ
4	سچھا کی سرگرمیاں ادارہ	سید علی عباس
شخصی مضمون:		
6	گاندھی ان لندن فہیم اختر	معاون مدیر
9	مزدوروں کے علمبردارڈاکٹر باباصاحب امبدیکر شیخ شبانہ بن محمد الیاس	سینیجو نگم
12	مرزا غالب اور قومی تحریکی ڈاکٹر پریم رومانی	
16	سرور جہاں آبادی: اردو کا ایک اہم نغمہ گو شاعر ڈاکٹر ندیم احمد	
 مضامین:		
20	اردو افسانے کا راقائی سفر سعید رحمانی	ناٹب مدیر
24	ماہیوسیوں کی گردھی ہے نگاہ پر شارق عدیل	محمد نبیں النصاری
کہانیاں / انسانے:		
30	تغف ڈاکٹر شاہین جیل	پبلشر
39	مجھے مال جائیئے ڈاکٹر ریاض تویدی	فیروزائیں پیچ
46	بے وفاکی کی سوغات شہاب الدین شیقان	ٹرٹی واعزادی سکریٹری ہندستانی پرچار سچا
49	خاموشیاں جو گنگا نے لیں تاہید طاہر	
55	عقلمند محمد علیم اسماعیل	
تصریح:		
58	پہلی جنگ آزادی اور بہادر شاہ نظر عبد اللہ عثمانی	قیمت: ۳۵/- روپے فی شمارہ
61	حفظِ انسان، خالق باری اور مجدد شیرانی پروفیسر صادق	سالانہ: ۱۰۰/- روپے
69	حکیم منظور کی شاعری میں شمیر سجاد حمد نجار	بیرون ملک: ۳۵۰/- روپے فی شمارہ
غزلیں:		
73	علیم صبا نویدی ، لطیف شاہد ، ظفر اقبال ڈاکٹر فیض احمد علیگ ، منظر خیامی ، طاہر نقاش	بیرون ملک سالانہ: ۱۰۰۰/- روپے
77	ریاض منصف، جبیب ندیم ، نادرہ ناز، ڈاکٹر متاز متوار نظمیں: گجراتی نظمیں۔ جیتنیت پر مار (ترجمہ)	(دو سال سے زائد کا زر سالانہ قبول نہیں کیا جائے گا)
78	ڈاکٹر عالمدار عدم، فردوس گیاوا۔ مصداق عظیمی منی آڑڈا/چیک	
79-80	پندرہ بیلبش جناب فیروزائیں پیچ، ماں ہندستانی پرچار سچا نے سید علی عباس کے زیر ادارت انڈنگوں میں، لی آریم/۱۰، گستاخ مل، دیوبی دیال کپونڈہ، نزدیک تانیپور، برے رو، (مشرق)، ممبئی - ۴۰۰۰۰۱، سے جیپوا کر ہندستانی پرچار سچا بھائیاں گاندھی میموریل بلڈنگ، بینیتا چھاٹ روڈ، بی۔ ۲۰۰۰۰۰۲۔ ۲۰۰۰۰۰۰۲ سے شائع کیا۔ "ہندستانی زبان" میں شائع شدہ مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ مختلف مصنف کے ہیں۔ ان سے ایک پیر یا پہنچ شکر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ "ہندستانی زبان" میں شائع شدہ مضامین کے استعمال کے لیے مصنف اور پبلشر سے اجازت لئی ضروری ہے۔ ہندستانی زبان سے متعلق تنازع امور میں سعات کا حق صرف عدالت عالیہ کی دوگا۔	'Hindustani Prachar Sabha' کے نام سے بھجوائیں۔

پندرہ بیلبش جناب فیروزائیں پیچ، ماں ہندستانی پرچار سچا نے سید علی عباس کے زیر ادارت انڈنگوں میں، لی آریم/۱۰، گستاخ مل، دیوبی دیال کپونڈہ، نزدیک تانیپور، برے رو، (مشرق)، ممبئی - ۴۰۰۰۰۱، سے جیپوا کر ہندستانی پرچار سچا بھائیاں گاندھی میموریل بلڈنگ، بینیتا چھاٹ روڈ، بی۔ ۲۰۰۰۰۰۰۲۔ ۲۰۰۰۰۰۰۲ سے شائع کیا۔ "ہندستانی زبان" میں شائع شدہ مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ مختلف مصنف کے ہیں۔ ان سے ایک پیر یا پہنچ شکر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ "ہندستانی زبان" میں شائع شدہ مضامین کے استعمال کے لیے مصنف اور پبلشر سے اجازت لئی ضروری ہے۔ ہندستانی زبان سے متعلق تنازع امور میں سعات کا حق صرف عدالت عالیہ کی دوگا۔

ہماری بات

جنوری کا مہینہ آیا، نیا سال مبارک ہو۔ جنوری کا مہینہ نئے حوصلے کے آتا ہے، لوگوں میں نیا جوش بھرتا ہے۔ سال گزرنے کی ہماری آخری رات بڑی پُر کیف، نگین، اچھل کو داور جوش و سرسرت کی رات ہوتی ہے۔ اس رات ہم گزرے برس کوستے ہیں اور نئے سال کا پُر تپاک خیر مقدم کرتے ہیں۔ ہم نئے سال کے تین بہت پُرمیں ہوتے ہیں، نئے سال سے بڑی توقعات رکھتے ہیں اور اس کے استقبال میں نیندیں حرام کر کے طرح طرح کے جشن مناتے ہیں۔ ہٹل بک ہوتے ہیں، ہٹلوں میں رقص و سرور کی محفلیں آراستہ کی جاتی ہیں اور لوگ خوب خوف لطف اٹھاتے ہیں۔ اکثر و پیشتر عیش و نشاط کی یہ محفلیں تنازع کا سبب بن جاتی ہیں کیوں کہ بعض لوگ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو جاتے ہیں اور بے قابو کر غیر شریفانہ حرکتیں کر گزرتے ہیں، جو نہیں ہونی چاہئیں۔

اسی جنوری کی ۲۶ تاریخ کو ہم اپنا یوم جمہوریہ مناتے ہیں۔ اس دن پورے ملک میں خوشی کا ماحول ہوتا ہے۔ سرکاری، بیم سرکاری، غیر سرکاری تمام دفتروں میں نیکٹریوں میں تعطیل ہوتی ہے۔ تمام اداروں میں پروگرام منعقد کئے جاتے ہیں جو پرچم کشائی کے بعد انجام پاتے ہیں۔ اسکو لوں، کالجوں، میں طرح طرح کے مقابلے اور کھلیل کو دکا بھی انتظام ہوتا ہے۔ جگہ جگہ وطن پرستی کے گیت گائے جاتے ہیں اور جوشی تقریبیں ہوتی ہیں۔ اس دن ملک کی راجدھانی دہلی میں خاص پروگرام ہوتے ہیں جنہیں ٹوپی پر لائیو ٹیلی کاست کیا جاتا ہے۔ طرح طرح کی جھانکیوں کے ذریعہ عوام کو اپنے ملک کی ترقی اور کارگزاری سے باخبر کروا یا جاتا ہے۔ عوام انھیں دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ ان میں حوصلہ پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنے ملک کی ترقی و طاقت کا اندازہ کر کے فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہ سب ضروری بھی ہے، یہ تمام سرگرمیاں عوام کے دلؤں کو حوصلہ بخشتی ہیں۔ ان تقریبات سے عوام کو اپنی طاقت اور کارکردگی کا پتہ چلتا ہے تو وہ جوش و سرسرت سے جھوم اٹھتے ہیں۔ یوم جمہوریہ ہندوستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ یوم جمہوریہ اس جمہوریت کے قیام کا دن ہے جس دن ملک کے ہر شہری کو یہاں حقوق فراہم ہوئے ہیں۔ ہم خوشی مناتے، جھومنتے، گاتے بجاتے ہیں، گفراؤں کہ یہ سب جوش و ولہ چھٹیں جنوری کے دن تک ہی سمٹ کر رہ گیا ہے۔ ہمیں صرف اس مخصوص دن ہی جمہوریہ اور جمہوریت کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہم پھر اپنی بھیڑ چاں میں لگ جاتے ہیں۔ جمہوریت کا اصل مقصد تو تب حل ہوگا جب اُسے روزمرہ کی زندگی میں بر تجاوے۔ ہمیں یہ بات ہرگز نہیں بھولنی چاہیے کہ جمہوریت کی بقاء کے لیے تعلیم، بہت ضروری ہے۔ جمہوریت کی نشوونما تعلیم کی ترویج و اشاعت کے بغیر ممکن نہیں۔ ایک پڑھا لکھا شہری ہی جمہوریت کے

اصولوں کی پاسداری کر سکتا ہے، مگر جب ہم تعلیم کے موضوع پر غور کرتے ہیں تو خود کو بہت پسمندہ پاتے ہیں۔ ایسے میں جمہوریت کے مستقبل سے مایوسی ہی مایوسی نظر آتی ہے۔ آج کی صورتِ حال بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ شاید اسی صورتِ حال کے پیش نظر علامہ اقبال نے اپنے شعر سے

بندوں کو گناہ کرتے ہیں، تو انہیں کرتے جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں

میں جمہوریت کی وضاحت کی ہے۔

ہندوستان دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے۔ حصول آزادی کے بعد وطن عزیز نے اپنے نظام حکومت کے لیے جمہوریت کے راستے کا انتخاب کیا تھا۔ اُس وقت یہ موقع کی گئی تھی کہ جمہوری راستے پر چل کر ہی ملک خوشحالی اور ترقی سے ہمکار ہو کر دنیا کے دوسرے ملکوں کی صفائی میں اپنا باوقار وجود قائم رکھ سکے گا، مگر ستم ظریفی یہ ہے کہ اے رسال بعد بھی معاملہ اس کے بر عکس ہے۔ آج بھی عوام میں بے چینی قائم ہے۔ سیاسی پارٹیوں کی رقباتوں نے جمہوریت کو مزید نقصان پہنچایا ہے۔ آپس کی یہ چیقلش ترقی کی راہ میں ہمیشہ رکاوٹ بنی رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج عوام خود کو ٹھگا ہوا محسوس کر رہے ہیں۔ جمہوریت تو وہ سیاسی نظام ہے جس کا محور عوام ہیں۔ اقتدار کی تمام را ہیں عوام سے ہی ہو کر گزرتی ہیں۔ عوام ہی طاقت کا مرکز ہوتے ہیں۔ وہ اپنی مرضی سے اپنے قائد اور حکمران کا انتخاب کرتے ہیں۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ جمہوریت ہماری طاقت ہے، اس کا تحفظ ہماری ذمہ داری ہے۔ ہمیں اپنے قائدین کے انتخاب میں بھی اس بات کا لاحاظہ رکھنا چاہیے کہ ہمارا قائد جمہوریت کے اصولوں پر گامزن ہو۔ اس عظیم طاقت کی حفاظت کے لیے ہمیں ہمیشہ چونکا رہنے کی ضرورت ہے۔

سید علی عباس

۲۰۱۹ء
رج نوری

سجھا کی سرگرمیاں

مورخہ ۵ اکتوبر ۲۰۱۸ء کو ہندی وہیں کے موقع پر ہندی کلاس کے غیر ملکی طلباء کے لیے ہندی رسم الخط کا مقابلہ منعقد کیا گیا جناب فیروز پیچ (ٹرٹی واعزادی سکریٹری) کی صدارت میں غیر ملکی طلباء کی اول جماعت کے جانب ڈن جن ہوگا، دوسری جماعت کے جانب مامی یوشیدہ و تیسری جماعت کے ملائ جنگ کو انعامات سے نواز گیا۔ انہوں نے ان طلباء کے رسم الخط کی تعریف بھی کی۔ آسان ہندی کلاس میں دپیکا گولیکر کو بھی انعام سے نواز گیا۔

مورخہ ۷ اکتوبر ۲۰۱۸ء کو تلاشگانہ کے مرکزی جیل میں تین کتب خانوں کا افتتاح جناب فیروز پیچ (ٹرٹی واعزادی سکریٹری) اور ڈی آئی جی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ سب سے پہلے ریاست حیدر آباد کے چھل گڑا جیل میں کتب خانہ کا افتتاح جناب فیروز پیچ نے جیل خانہ کے پر نیشنل نٹ کی موجودگی میں ناریل پھوڑ کر کیا، اسی طرح خواتین قیدیوں کے کتب خانے کا افتتاح بھی خاتون سپرنیشنل نٹ کی موجودگی میں ہوا۔ حیدر آباد کے چیر اپنی جیل میں وہاں کے قیدیوں کے لیے قائم لاہوری کا افتتاح بھی ڈی آئی جی کی موجودگی میں ہوا۔ سجھا کی طرف سے جناب سنجیو نگم اور رائیش کمار تراپاٹی بھی حاضر تھے۔

مورخہ ۲۲ اکتوبر ۲۰۱۸ء کو اندرین مرچنٹس چیسٹ، واقع چرچ گیٹ، ممبئی میں ہندستانی پرچار سجھا کی جانب سے تعلیم ۳۶۰ کے عنوان پر مذکورہ کا اہتمام کیا گیا۔ یہ مذکورہ ایک ایسے موضوع پر تھا جو آج کے سماج کی ضرورت ہے۔ اس میں دانشوران، اساتذہ کرام پرنسپل حضرات، ماہر نفسیات و عوامی خدمتگاروں نے حاضرین سے خطاب فرمایا۔ اس جلسہ کی افتتاحی تقریب کا افتتاح جناب ظہیر قاضی (صدر انجمن اسلام) نے، جناب شیخ شاہ (صدر ہندستانی پرچار سجھا) کی صدارت میں فرمایا۔ جناب فیروز پیچ (ٹرٹی واعزادی سکریٹری)۔ جناب ارینڈ گولیکر (ٹرٹی وحازن) نے بھی خطاب فرمایا۔ جناب سنجیو نگم (ڈائریکٹر پروگرام) نے کامیاب نظمت فرمائی۔ تعلیم و سماج، ذاتی ذمہ داریاں، تعلیم کی اہمیت تعلیم و روزگار، بیویوں کی تعلیم، اساتذہ کرام کی تربیت وغیرہ موضوعات پر دانشوران جناب کاظم ملک، جناب ضیاء الدین انصاری، محترمہ ساگر بھٹا چاریہ، جناب ڈاکٹر دیانت دیواری وغیرہ نے سیر حاصل گنتگوکی۔

مورخہ ۲۴ اکتوبر ۲۰۱۸ء کو عنوان اپنے پیارے شاعر سے ملنے میں سرل ہندی جماعت کے طلباء نے ڈاکٹر بدھی ناطھ مشر سے ملاقات کی جن کا تعارف سشیلا گپتا نے کرایا۔ اس موقع پر انہوں نے زالا جی کو خراج عقیدت پیش کیا۔ طلباء نے ڈاکٹر مشر سے سوالات کے ارجانکاری حاصل کی۔

مورخہ ۲۰ اکتوبر ۲۰۱۸ء کو مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ (موکا) مارتیشیں میں واقع کتب خانہ میں ہندستانی پرچار سجھا کے ذریعہ قائم پرستک سجھا کا افتتاح انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر جنگ جناب جے نارائے، جناب سنجیو نگم ڈائریکٹر (پروگرام) کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اسے قائم کرنے میں مارتیشیں کے نامور تاریخ داں ہیرا من کا بہت بڑا تھرہ رہا۔

مورخہ ۲۰ اکتوبر کو گاندھی جنگی میانے ہوئے ہندستانی پرچار سجھا میں ڈاکٹر سشیلا گپتا کی کتاب ’کچھ پڑھت لکھت‘ اور رسالہ ’ہندستانی زبان خاص کہا یا، کی رسم اجراء منعقد ہوئیں۔ شروعاتی خطبہ دیتے ہوئے، سجھا کے ٹرٹی واعزادی سکریٹری محترم فیروز پیچ نے

فرمایا کہ آج گاندھی جی کے اصولوں اور ان کی فکر کے تین ہمیں سماج میں بیداری مہم چلانے کی ضرورت ہے۔ اس موقع پر مشہور انسانہ نگار سلام بن رزاں نے فرمایا کہ ہندوستان کی گنجائی تہذیب کا جو نظر یہ گاندھی جی کا تھا، اسے ہندستانی پرچار سمجھا اپنی مختلف سرگرمیوں کے ذریعہ بخوبی پورا کر رہی ہے۔

مورخہ ۱۳/۱۰ اکتوبر ۲۰۱۸ء کو گجرات یونیورسٹی احمد آباد کے احاطہ میں بعنوان جدید ہندوستان میں ایک قدیم روگ پر مذاکرہ کا اہتمام کیا گیا۔ مہاتما گاندھی جی کی اس ڈیڑھ سو سالہ جنیق کے موقع پر سمجھا کے طشدہ پروگرام کے تحت یہ پہلا جلسہ تھا، جس میں غیر ہندی وال مقرر حضرات نے شرکت کی۔ مذاکرہ کا افتتاح گجرات یونیورسٹی کے چانسلر پروفیسر انامک شاہ اور مدھیہ پر دلیش کے اندر اگاندھی پسمند یونیورسٹی کے چانسلر ڈاکٹر ٹی وی کٹھنی کی موجودگی میں کیا گیا۔ دونوں کے اس جلسہ مذاکرہ میں مختلف عنوانات پر پروفیسر گورانگ جانی، پروفیسر گھنٹیام شاہ اور ماہر سماجیات پر کاش شاہ نیز پروفیسر ودت جوشنی، نیر و پیل، بندو پار تھیش، مول چندرانا، راجو سونگ، مارٹن کوان، چندو ہمیریا اور پروفیسر ایم پی مختاری و دیگر ماہرین نے خیالات کا اظہار کیا۔

۳ نومبر ۲۰۱۸ء کو سمجھا کے ذریعہ سرل ہندی کلاس کے اساتذہ کے لیے ایک ورکشاپ رکھا گیا۔ سمجھا کے ٹرٹی واعزازی سکریٹری جناب فیروز پیٹھ نے اساتذہ سے خطاب فرماتے ہوئے کہا کہ قابل استاد بنتے ہوئے کہا کہ قابل علم بن کر علم کا حصول کرنا ضروری ہے۔ ڈاکٹر سمتیش پانڈے، ڈاکٹر شیلا گپتا، ڈاکٹر مادھوری پالل، ڈاکٹر متحلیں شرما، ڈاکٹر انیل سنگھ، ڈاکٹر کاٹیاں، ڈاکٹر جے شری سنگھ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مختلف عنوانات پر روشی ڈالی۔ سرل ہندی کلاس کے طلباء سدھیر ریگے، ہسپریا گاؤنگر، اسمتا پاؤلو اور ریمش کیتے کہاںی پر دیسی پر ڈرامہ پیش کیا۔ جناب سنجیو نگم (ڈاکٹریکٹر پروگرام) نے حاضرین کا استقبال کیا۔

۱۹ نومبر ۲۰۱۸ء کو سمجھا کے ذریعہ راجستان کے تمام مرکزی جیلوں میں قیدیوں کے لیے کتب خانے قائم کئے گئے۔ راجستان پولیس کے ڈی جی پی شری بھوپیندر سنگھ اور سمجھا کے شری سنجیو نگم ڈاکٹریکٹر (پروگرام) کی خصوصی موجودگی میں اس کا افتتاح ہوا۔ ۲۰ نومبر ۲۰۱۸ء کو ہندستانی پرچار سمجھا اور دی ہینڈ آف ہوپ فاؤنڈیشن کے ذریعہ پچھوں کے جنی اساتھیں کا کرب جھیلیے والے اشخاص کی تصویری نمائش کا اہتمام سمجھا بھون میں کیا گیا۔ اس موقع پر ایک مذاکرہ منعقد ہوا جس میں سماجی خادموں، ماہر نفسیات اور زرائع ابلاغ کے نمائدوں اور جنپی اساتھیں کا شکار ہونے والے افراد نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور سماجیں کے سوالوں کا جواب بھی دیا۔

مورخہ ۱۳/۱۰ اکتوبر ۲۰۱۸ء کو مکمل برائے انسانی وسائل کی مدد سے سمجھا کے مختلف شعبوں کے طالب علموں کے لیے مضمون نویں و تقریری مقابله منعقد کئے گئے۔ صدر محترمہ ڈاکٹر شیلا گپتا نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور سماجیں کے سوالوں کا جواب بھی دیا۔ پیاس کی سائھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ پروگرام کے آغاز میں محترمہ پر بھاوی دا بھولکرنے سمجھا کی سرگرمیوں پر روشی ڈالی کہ ہماری سمجھا ہندستان کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مضمون نویں مقابلوں میں خان زیبا نقش کو اول، انصاری محمد حسین رشید انور کو دوم، انصاری ام حبیبہ محمد کلیم کو سوم اور انصاری اذکیہ عبداللہ کو خصوصی انعام سے نوازا گیا۔ تقریری مقابله میں شیخ محمد طلحہ عقیل احمد کو اول، انصاری سمیع ایس کو دوم، شیخ شیریں بانو محمد شاہ نواز کو سوم اور انصاری شاہینہ بیمن و صدیقی نانی یغم غلام محمد کو خصوصی انعامات دئے گئے۔ جناب رئیس انصاری نے نظمت کے فرائض کے علاوہ سماجیں کا شکریہ ادا کیا۔



گاندھی ان لندن

فہیم اختر (لندن)

۲۰ اکتوبر کو پوری دنیا گاندھی جیتی مناتی ہے۔ دنیا کے تقریباً تمام ممالک میں جہاں ہندوستانی اور گاندھی نواز بسے ہیں اس تقریب کو بڑے عزت و احترام سے مناتے ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا بھر میں موجود ہندوستانی سفارتخانے میں خاص پروگرام کا انعقاد کیا جاتا ہے، جہاں سیاستدار، سفارتکار، ماہر تعلیم اور عام لوگ شرکت کرتے ہیں اور گاندھی جی کے پیغامات پر عمل کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔

گاندھی جی کا لندن سے قربی رشتہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی کئی بار لندن تشریف لائے۔ ۲۹ ستمبر ۱۸۸۸ء میں گاندھی جی سب سے پہلے لندن تعلیم حاصل کرنے کے لیے آئے تھے۔ لندن پہنچتے ہی سب سے پہلے گاندھی جی نے وکٹوریہ ہوٹل میں کچھ دن گزارا۔ اس کے بعد لندن سے قریب ہی ریچمنڈ علاقے میں کچھ عرصے تک قیام کیا اور پھر ویسٹ کیجگٹن میں کرایے کے ایک کمرے میں رہنا شروع کر دیا۔ شروع میں گاندھی جی نے 'الکشن جیٹلین میں' کے طور پر زندگی گزارنی شروع کی لیکن بڑھتے ہوئے اخراجات کی وجہ سے انہیں اپنے زیادہ تر نئے انگریزی شوق کو چھوڑنا پڑا۔ قانون کی تعلیم کے ساتھ ساتھ انہوں نے ۱۸۹۰ء میں یونیورسٹی آف لندن سے میٹرک کا متحان بھی پاس کیا۔

اس غریب پور، ایشور اور اللہ پر یقین رکھنے والے ایک معمولی انسان جس کی انسان دوستی اور عدم تشدد کے اعزاز میں ان کا مجسمہ لندن کی تاریخی پارلیمنٹ اسکواٹر میں لگایا گیا ہے، جو پہلی آف ویسٹ منستر کے بالکل قریب ہے۔ ۱۵ اگسٹ ۲۰۱۴ء کو لندن میں گاندھی جی کے مجسمے کی نقاب کشانی کی گئی تھی۔ گاندھی جی کے مجسمے کی نقاب کشانی کا ایک خاص مقصد جنوبی افریقہ سے ہندوستان والپی کی سوسائٹی کے خلاف تحریک چلانے اور ہندوستانیوں کے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے کے جرم میں معتمد بار جیل بھی جانا پڑا۔

برطانیہ کے دو معروف وزیراعظم بخا ممن ڈیسرا یکلی اور نوٹن چرچل کا مجسمہ بھی بیہیں لگا ہوا ہے لیکن سب

سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ گاندھی جی کے مجسمے کو نسٹن چرچل کے مجسمے سے بالکل قریب لگایا گیا ہے جو کہ کئی معنوں میں اہمیت کا حامل ہے۔ (The Gandhi Statue Memorial Trust)

دی گاندھی اسٹپو میموریل ٹرست، کی گزارش پر گاندھی جی کا مجسمہ دیگر مجسموں کے مقابلے اونچائی پر ہونے کے باوجود سب میں چھوٹا بنایا گیا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ گاندھی جی اپنے آپ کو عام لوگوں کی طرح سمجھتے تھے۔

۱۹۳۰ء میں اس وقت کے وزیر اعظم نسٹن چرچل نے انہی سے بھرپور ایک بات گاندھی جی کے متعلق کہی تھی کہ: ”گاندھی ایک معمولی سماوکیل جو کہ آدھے کپڑوں میں ملبوس بالکل فقیر دکھتا ہے۔“ سوانح نگار کے مطابق چرچل نے ایک بار گاندھی جی کے متعلق یہ بھی کہا تھا کہ: ”گاندھی کو ایک بڑے ہاتھی سے رونڈالنا چاہیے۔“

یہ بات چرچل نے گاندھی جی کی سویں نافرمانی تحریک کے حوالے سے کہی تھی جو انگریزی حکومت کے خلاف چلا رہے تھے۔ اس کے عکس اب برطانیہ میں گاندھی جی کو نہایت عزت و احترام سے دیکھا جاتا ہے۔ اب یہاں کے عام لوگ برطانیہ کی نوابادیاتی تاریخ پر فخر نہ کر کے گاندھی جی کی سویں نافرمانی تحریک، اور عدم تشدد کے پیغام کو کافی سراہ رہے ہیں۔

معروف انگریز مصور فلپ جنکس نے اس مجسمہ کو تعمیر کیا ہے۔ اس سے پہلے فلپ جنکس نے ملکہ کی ماں کا بھی مجسمہ بنایا تھا۔ ۱۹۳۱ء میں گاندھی جی کے لندن دورے کی ایک تصویر دیکھ کر مصور نے اس مجسمے کو بنایا ہے۔ یہ نو فٹ لمبا اور اس میں تین چوتھائی ٹن کا نسے کا استعمال کیا گیا ہے۔ گاندھی جی پہلے ہندوستانی ہیں جن کا مجسمہ پارلیمنٹ اسکولائر میں لگایا گیا ہے۔ گاندھی جی واحد ایسی شخصیت ہیں جنہوں نے کوئی سیاسی یا سرکاری عہدہ قبول نہیں کیا تھا۔ اس پروجیکٹ پر ایک ملین پونڈ سے زیادہ کا خرچ آیا تھا۔ اس مجسمے کو بنانے کے لیے چھ مہینے سے کم عمر صے میں رقم اکٹھا کی گئی تھی۔ اس کے لیے بیشتر عطیات برطانیہ اور ہندوستان کے لوگوں نے دیا ہے۔ دی گاندھی اسٹپو میموریل ٹرست

(The Gandhi Statue Memorial Trust) جس کے چیئر لارڈ میکھن اڈیسائی ہیں جنہوں نے اس مجسمہ کی تعمیر کے لیے ایک ملین پونڈ جمع کیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ یہ رقم لگ بھگ چھ مہینے میں عطیات کے ذریعہ جمع کی گئی تھی۔

جس میں ہندوستانی صنعت کارکشی میل کا نام قابل ذکر ہے، جنہوں نے اس پروجیکٹ کے لیے 100.000 £ پونڈ کا عطیہ دیا تھا۔

۱۹۳۱ء میں گاندھی جی جب دوبارہ لندن آئے تو انہوں نے لندن کے غربت زده مشرقی علاقے میں ٹھہرنا کو ترجیح دی۔ اس دوران اُن سے معروف اداکار چارلی چپلین نے بھی ملاقات کی تھی۔ اس کے بعد گاندھی جی انکا شائر تشریف لے گئے جہاں انگریز مزدوروں پر حقوق کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ کائن مل کے احتجاجی مزدوروں نے گاندھی جی سے ملاقات کی۔ گاندھی جی نے انگریز مزدوروں کو خاموش کرتے ہوئے کہا کہ ”اب خاموشی سے کچھ لمحے کے لئے میری بات سنیے، مجھے پہتہ ہے کہ چند مہینے سے انگلینڈ میں ۳۰ لاکھ لوگوں کو کوئی کام نہیں ہے اور آپ کو کھانے پینے کے لئے صرف روٹی دستیاب ہے۔ ہندوستان میں ہر سال چھ مہینے، ۳۰ رکروڑ لوگ یہ روزگار رہتے ہیں اور کئی دنوں تک انہیں کھانا نصیب نہیں ہوتا ہے“۔ گاندھی جی کی بات کو سن کر انگریز مزدوران کے شیدائی ہو گئے۔

یہ سچ ہے کہئی دہائیوں سے ہندوستان میں اسکولی بچوں کو گاندھی جی کے بارے میں ’قوم کا باپ‘ ہونے کا درس دیا جا رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہندوستان میں گاندھی جی کی شکل کرنی سے لے کر سرکاری عمارتوں پر نظر آتی ہے جو کہ ایک قومی جذبہ کی عمدہ مثال ہے۔ لیکن اب ہندوستان میں یہ روایت یقینی سے بدلتا رہا ہے۔ اس کی ایک وجہ جہاں ہندوستان کی ہائی ٹیک مارکیٹ، صنعت و حرف اور شہروں کی ترقی ہے تو وہیں دوسری طرف ہندوستان کے گاؤں اور اس کی بدخالی سے گاندھی جی کے خواب کو دھکا ضرور پہنچا ہے۔

اب نئی نسل آرائشی مصنوعات کا استعمال کرنا، غیر ملکوں کا سفر کرنا یا غیر ممالک میں جا کر بسنے کو زیادہ ترجیح دیتی ہے۔ جب کہ گاؤں کی ترقی اور گاندھی جی کے چرخہ کی کتابی اب محض ایک کہانی بن کر رہ گئی ہے۔ اس کے علاوہ جن مزید باتوں نے گاندھی جی کے خواب کو چکننا چور کیا ہے وہ سرمایہ دارانہ نظام، ذات پات کا فرق، عدم مساوات، سیاسی بدعنوی، مذہبی تشدد اور عام آدمی کے روایتی میں تبدیلی وغیرہ ہیں۔ آج ہمیں گاندھی جی کے عدم تشدد اور بھائی چارگی کے پیغام کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ آئیئے ہم اور آپ ایک بار پھر گاندھی جی کی زندگی اور ان کے پیغامات پر عمل کرنے کا عہد کریں اور امن قائم کریں۔



مزدوروں کے علمبردار: ڈاکٹر بابا صاحب امبدیڈ کر (۱۸۹۱-۱۹۶۵)

شیخ شبانہ بنو محمد الیاس

ریسرچ اسکالر پی ایچ ڈی اردو

ڈاکٹر بابا صاحب امبدیڈ کر مراثواڑہ، یونیورسٹی اور نگ آباد

ڈاکٹر بابا صاحب امبدیڈ کر کا اصل نام بھیم راؤ سکپال تھا۔ وہ ۱۸۹۱ء میں مدھیہ پردیش کے ایک گاؤں مہوئیں پیدا ہوئے۔ ان کے والدرا م جی سکپال فوج میں ملازم تھے۔ بعد میں ملازمت ختم کر کے وہ ستارا میں آباد ہو گئے۔

ان کی ماں کا نام بھیما بائی تھا۔ چھپڑی ذات کا ہونے کی وجہ سے انھیں تعلیم حاصل کرنے میں کئی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اسکول میں انھیں دوسرے لڑکوں کے ساتھ بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی۔ ان کے اسکول میں امبدیڈ کر نامی ایک استاد تھے۔ جو بھیم راؤ کو بہت چاہتے تھے۔ بھیم راؤ کو بھی اپنے استاد سے بہت محبت تھی۔ اس لیے وہ اپنا نام بھیم راؤ امبدیڈ کر لکھنے لگے۔ ابتدائی تعلیم پوری کرنے کے بعد وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان چلے گئے۔

ایک زمانہ تھا جب ہمارے ملک میں ذات پات کا رواج عام تھا۔ بہت سے لوگ دلوں کو کم تر سمجھتے تھے۔ انھیں کنوں، جھیلوں اور تالابوں سے پانی لینے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ مہاڑ کا پودار تالاب بھی ان میں سے ایک تھا۔ آخر ایک دن لوگ اس نا انصافی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور پودار تالاب کے کنارے پہنچ گئے۔ ان کے لیڈر نوجوان بھیم راؤ امبدیڈ کر تھے۔ بھیم راؤ چھپڑی ذات سے تعلق رکھتے تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے تالاب میں اتر کر پانی چھوا۔ دوسرے لوگوں کو بھی حوصلہ ملا اور انہوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس طرح تالاب کا پانی سب لوگوں کے لیے عام ہو گیا۔

انگلستان سے لوٹنے کے بعد ڈاکٹر امبیڈ کرنے ملک سے ذات پات کی تفریق کو مٹانے کا پکا ارادہ کیا۔ اس زمانے میں دلوں کو مندروں میں جانے نہیں دیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر امبیڈ کر کی کوششوں سے ان کے لیے مندروں کے دروازے کھل گئے۔ ڈاکٹر امبیڈ کر کہا کرتے تھے سماج میں عزت کی زندگی گزارنے کے لیے تعلیم حاصل کرنا بے حد ضروری ہے۔ انہوں نے بہت سے اسکول اور کالج کھولے۔ عورتوں کی تعلیم پر بھی توجہ دی۔ ڈاکٹر امبیڈ کر ایک اچھے قانون دال تھے۔ آزاد ہندوستان کا دستور بنانے کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی تھی اور وہ اس کمیٹی کے صدر تھے۔ ملک کا دستور بنانے میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔

آزاد مردor پارٹی کا سالانہ اجلاس یہ راگست کو بمبئی کے ناگپورہ علاقے میں منعقد کیا گیا۔ اس عام اجلاس میں ڈاکٹر امبیڈ کر کو اتفاق رائے سے صدر اور خازن منتخب کیا گیا۔ بمبئی اسمبلی میں ۲۳ اگست ۱۹۳۷ء کو وزیروں کے مشاہیر، گھر کے کرائے اور سفر بھتے کے بارے میں ایک بل بحث کے لئے پیش کیا گیا۔ اس موقع پر اس بل کی سخت مخالفت کرتے ہوئے ڈاکٹر امبیڈ کرنے کہا کہ ”تخواہ پر غور کرتے ہوئے کام کی صلاحیت، سماجی رتبہ اور جمہوریت و حکومت کے تین خلوص کو بھی نظر میں رکھا جانا چاہیے۔ کوئن علاقے کے کھوت، یعنی زمیندار اپنے پٹہ داروں کا سیکڑوں سال سے استھصال کر رہے تھے۔ ان کسانوں کو زمینداروں کے استھصال سے نجات دلانے کے لئے ڈاکٹر امبیڈ کرنے ۷ اگست ۱۹۳۷ء کو اسمبلی میں ایک بل پیش کیا۔ کسانوں کی حمایت میں بل پیش کرنے والے ڈاکٹر امبیڈ کر اولین رکن تھے۔ اس بل میں یہ تجویز رکھی گئی تھی کہ ان زمینداروں کی زمین کے مالکانہ حقوق ختم کئے جائیں اور اس کے بدلتے انہیں معاوضہ دیا جائے اور صرف وہی زمین کا مالک بنے جو زمین پر کھیت کر رہا ہے۔ لیکن حکمران طبقے نے اس بل کو لٹکائے رکھا۔ مہارذات کی آبائی جائداد کے حقوق کے قانون میں اصلاح کے لئے بھی ڈاکٹر امبیڈ کرنے ایک بل پیش کیا، مگر اسے بھی سردخانے میں ڈال دیا گیا۔

احمد آباد کے نزدیک بانکا گاؤں کے اچھوت سماج کا افلاس دیکھ کر وہ آبدیدہ ہو گئے۔ وہاں سے لوٹتے وقت کھیما بھائی ہاں میں ان کی تقریر ہوئی جس کے دوران انہوں نے واضح کیا کہ وہ گاندھی جی کی مخالفت کیوں کر رہے ہیں۔ انہوں نے یہ سوال بھی اٹھایا کہ بمبئی اور مدھیہ پردیش کی وزارت میں ایک بھی اچھوت وزیر کیوں نہیں ہے؟ ۳۱ نومبر ۱۹۳۸ء کو نیپانی شہر میں ان کا زبردست استقبال کیا گیا۔ انہیں ۵۰ بیلوں کے ذریعے بھیج گئے تھے

پر بھا کر ان کی شو بھایا تر انکالی گئی۔ اجرت طے کرنا، پہنچ داری کے خاتمہ کا قانون پاس کرنا، زمینداری کا خاتمہ اور چھوٹے کسانوں کے لئے پانی کی قیمت گھٹانا، وغیرہ مطالبات کو انہوں نے اس موقع پر پیش کیا۔ میمورنڈم پیش کرنے کے بعد جلوس آزاد میدان پہنچا، وہاں ڈاکٹر امبیڈ کرنے ایک عالمانہ تقریر کی، جس میں انہوں نے کہا:

”دنیا میں دوہی طبقے ہیں۔ ایک استھصال کرنے والا اور دوسرا استھصال زده۔ مزدوروں اور کسانوں کو ذات پات ترک کر کے، متعدد ہو کر اسمبلی میں اپنے نمائندے منتخب کر کے سمجھنے چاہئے۔ تبھی ان کا فائدہ ہو سکے گا۔“

کسانوں اور مزدوروں کے مسائل کے حل کے لئے جدوجہد کا راستہ اپنانے کی بنا پر ڈاکٹر امبیڈ کر کو تقریر کرنے کے کافی دعوت نامے آنے لگے۔ مزدوروں اور کسانوں کا ایک جلسہ احمد نگر میں ہوا، جہاں ان کو مدعو کیا تھا۔

۲۵ جنوری ۱۹۳۸ء کو وہاں ان کی نہایت پُرا شر تقریر ہوئی۔ اس کے بعد وہاں کے مقامی ضلع بورڈ میں وکلا کی طرف سے ناشتہ پر مدعو کیا گیا۔ شام کے وقت وہ اسی ضلع کے اکولا گاؤں گئے اور وہاں بھی انہوں نے ایک جلسے سے خطاب کیا۔ جادھوی گاندھی اور دھیرج لاں نامی دو سطہ بازوں کو جو اکھیلے کے جرم میں چیف محستریٹ نے سزا نامی تھی جسے بمبئی ہائی کورٹ نے بھی برقرار کھا تھا۔ بمبئی حکومت نے ان دونوں کی سزاوں کو اپنے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے موقوف کر دیا۔ عدل کے شعبہ میں حکومت کی اس خل اندازی پر جمناد اس مہتاب نے بمبئی اسمبلی میں تحریک التوا پیش کی۔ اس کی حمایت کرتے ہوئے ڈاکٹر امبیڈ کرنے پر یوی کوشل کا حوالہ دیا اور کہا:

”اس معاملے میں قانون کے اصولوں کی خلاف ورزی کی گئی ہے، جسے ثابت کئے بغیر ہندوستانی فوجداری عدالت کے فیصلے پر ہائی کورٹ میں اپیل منظور نہیں کی جاسکتی۔ اس طرح کے اقدامات سے عموم کے دلوں سے قانون اور رضا بطے اور نظام حکومت کے تین احترام اٹھ جائے گا اور شک و شبہ جاگزیں ہو گا۔ مجرموں کو دی گئی سزا کی معافی دینا قانون کو قتل کرنے کے مترادف ہے۔“

ملک کا عظیم قانون داں (جن کا دستور بنانے میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔) ۶ دسمبر ۱۹۵۶ء کو بھارت کے اس عظیم رہنماء کا انتقال ہوا۔



مرزا غالب اور قومی بھجتی

ڈاکٹر پریمی رومانی

ہندوستان ایک عظیم جمہوریہ ہے۔ اس کی تاریخ صدیوں پرانی ہے۔ یہاں مختلف مذاہب نے آنکھ کھولی۔ ان مذاہب نے اپنے طور سے اس ملک کو عظمت بخشی۔ یہاں کے بساں میں مل جل کر رہے ہیں بسنے کا جذبہ بیدار کیا اور اس ملک اور قوم کی بے لوث خدمت کی۔ ہر مذہب نے اس سرزی میں میں پیوست ہو کر جذبہ انسانیت کو فروغ دیا اور علم و ادب، گیان و عرفان اور عقل و دانش کے دروازے واکٹے۔

جہاں تک اردو شاعری کا تعلق ہے یہ بھی شروع سے ہی قومی وحدت اور جذبہ حب الوطنی سے سرشار رہی ہے۔ ولی دکنی سے لے کر عہد حاضر تک شاعروں کی ایک کہاشاں ہیں جنہوں نے ہندوستانی تہذیب و تمدن، رسم و رواج اور قومی بھجتی کے ساتھ ساتھ حب الوطنی کے نغمے بھی گائے ہیں اور اپنے خیالات سے دُنیا میں انسانیت کا پیغام دیا۔ اس سلسلے میں قطب، شاہ ولی دکنی، سودا، میر تقی میر، نظیر اکبر آبادی، مرزا غالب، بہادر شاہ ظفر وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ جنہوں نے اپنے اشعار سے حب الوطنی کا جذبہ پیدا کیا۔

مرزا غالب کی شاعرانہ عظمت سے کون کافر انکار کر سکتا ہے؟ ان کا کلام تمام اصنافِ سخن میں موجود ہے اور وہ ہر جگہ کامیاب نظر آتے ہیں لیکن اس کے باوجود یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان کا اصل میدان غزل ہے۔ غزل سے اُن کو فطری لگا و تھا۔ اسی لئے اُن کی غزوں میں زندگی کے حقائق جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مرزا کا کلام نازک خیالی اور بلند پروازی کے لئے مشہور ہے۔ اُن کی تشبیہات واستعارے بالکل غیر معمولی ہوتے ہیں اور کلام میں ایک خصوصیت پیدا کرتے ہیں۔ بلند پروازی کے ساتھ ساتھ صحیح جذبات نگاری کا جوہر ان کے ہاں ملتا ہے۔ فصاحت اور بلا غلت اُن کی شاعری میں خاص طور پر پائی جاتی ہے۔ سادگی اور پُر کاری اُن کا جوہر ہے۔ وہ روزمرہ اور باحاورہ زبان کو استعمال کرنے کے قابل تھے اسی لئے اُن کے کلام میں خیال آفرینی پائی جاتی ہے۔ اُن خصوصیات کے ساتھ ساتھ مرزا کی نظم و نثر میں وطن پرستی، قومی بھجتی اور انسان دوستی کا بھرپور احساس بھی

ہوتا ہے، مرزا کی شاعری میں انسانی احساسات اور تجربات کی پیچیدگیاں رمز و علامت کے حریری پر دوں میں چھپی ہوئی ملتی ہیں۔ ان کے استعاراتے ایک جہانِ معنی سمیٹے ہوئے ملتے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری، غالب کو انسان دوست شاعر قرار دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

”وہ انسانی دُنیا اور انسانی نظرت کے رموز و مسائل کے شاعر ہیں۔ ان کا پیغام انسانیت ہے۔ وہ آدمی ہونا اور آدمی رہنا سکھاتے ہیں۔ وہ ہم کو آگاہ کرتے ہیں کہ آدمی کا انسان ہونا آسان نہیں ہے۔ انہوں نے صرف انسان پر غور کیا جو شعور کا مکمل نمونہ ہے۔ یہ شعور انسان کا الیہ بھی ہے اور یہی اس کی خیر و برکت اور اس کی نجات کا ضامن بھی۔“

اس ضمن میں اُن کے چند اشعار پیش کئے جاسکتے ہیں۔ جن سے مرزا کے انسان دوست ہونے کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ مثلاً

آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا جب آنکھ کھل گئی نہ زیاد تھا نہ سود تھا ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغ نہاں اور ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں	بلکہ دشوار ہے ہر کام کا آسان ہونا تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ لوگوں کو ہے خورشید جہاں تاب کا دھوکا کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جھا کہتے ہیں
---	---

مرزا غالب کی نظم و نثر کا ایک بڑا حصہ سامراج و شہنشی اور وطن دوستی کے جذبات سے سرشار ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری سے عوام کا لہو گرما�ا اور ایک نئی دُنیا تعمیر کی۔ مرزا کہیں کہیں علماتوں کے ذریعے سے اور کہیں کہیں واضح اشاروں اور کنایوں سے امن پسندی، انسان دوستی، قومی تہجیتی، عالمی برادری، قوم پرستی اور حب الوطنی کا درس دیتے ہیں۔ ذکار الدین شایان اپنے ایک مقامے میں اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”غالب کی غزلیہ شاعری دیکھی تو اندازہ ہوا کہ اس میں غالب کے ماحول کا زندہ اور حقیقی عکس ہے۔ شہر دلی کی رسم و رواج روایات و تہذیب اور معاشرت و مذهب وغیرہ کے بکھرے بکھرے مگر بڑے تیکھے نقوش ملتے ہیں اگر ان نقوشوں کو جو اشاروں اور علماتوں کے چھوٹے چھوٹے خانوں میں سکڑے ہوئے ہیں، پھیلا دیا جائے تو غالب کے عہد کی بڑی زندہ تصویر یہ بن سکتی ہیں۔“

مرزا غالب کی زندگی میں ایک اہم موڑ ”غدر ہند“ کا ہے۔ اس انسانیت سوز واقعے سے ہندوستان کی

سیاسی اور سماجی زندگی میں ایک زبردست انقلاب کا باب کھلتا ہے اور ہندوستان کے لوگ صدیوں پر اپنی غلام در غلام زندگی کی تاریکیوں سے نکلنے کی راپیں تلاش کرنے لگتے ہیں۔ آزادی کی پہلی جنگ کا پہلا پتھر یہیں پر رکھا جاتا ہے اور اس کے بعد مسلسل یہ جنگ جاری رہتی ہے۔ یہاں تک کہ غلامی کے غلامی کے اندھروں میں سے آزادی کا اجala روکنے لگتا ہے۔ اس آزادی کو حاصل کرنے کے لئے ہندوستانی عوام کو کتنے ہفت خواں طے کرنے پڑے۔ اس کو بیان کرنے کا یہاں محل نہیں ہے البتہ یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اردو شعراء بھی مختلف سماجی رہنماؤں کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ انہوں نے اپنے نغموں سے انقلاب کو آواز دی۔ آزادی کی دیوی کی آرتی اُتاری۔ وقت کے تقاضوں کی ترجیحی کی اور لوگوں میں عزم استقلال ہمت، بہادری اور حب الوطنی کی آگ پیدا کی۔ آزادی وطن کے بے نام خواہش شاطر سامراجوں کی چال بازی پر اپنے کلچر کی بر بادی پر غالب جیسا غزل گوشاعر بھی چکے چکے آنسو بہاتار ہا اور اپنے جذبات کا غذ پر انڈیتار ہا۔ مثلاً

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ بساط دامنِ باغبان و کفِ گلِ فروش ہے

لطفِ خرام ساقی و ذوقِ صدائے چنگ یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبحِ دم جو دیکھتے آکر تو بزم میں نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے

مرزا غالب مختلف اصنافِ سخن کے وسیلے سے اپنے جذبات و خیالات کو فروغ دیتے رہے لیکن اردو غزل کو انہوں نے اپنے فکر فون سے تازگی اور توانائی عطا کی۔ مرزا کی شاعری میں بعض جگہوں پر جذبہ کائنات کا بھر پور احساس ہوتا ہے۔ وہ ہندوستانی کلچر پر فخر کرتے تھے اور ہندوستان کی عظمت کے گیت گاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی لئے عبدالرحمن بجنوری وید مقدس اور دیوان غالب کو دو الہامی تصانیف سے تعبیر کرتے ہیں اور رشید احمد صدیقی، غالب کی عظمت کے پیش نظر یہ کہتے ہیں کہ غالب، اردو اور تاج محل، مغلیہ سلطنت کی عطا کردہ تین چیزیں ہیں اور یہ تین چیزیں ہندوستان کی ہی پیداوار ہیں اور ہندوستان کے سوا کہیں بھی نظر نہیں آتی ہیں۔ مرزا کی شاعری میں جہاں ایک طرف تاریخی سیاسی کا سماجی اور انقلابی موضوعات بھی ملتے ہیں وہاں کہیں کہیں وہ ظلم اور غلامی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ مثلاً

آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہوتا بلکہ دشوار ہے ہر کام کا آسان ہونا

غالب کا یہ شعر سماجی تصوریت پر دلالت کرتا ہے۔

کبھی ہم ان کو بھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
آج ہی گھر میں بوریانہ ہوا
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
ہے خبر گرم ان کے آنے کی
دیکھتے غالب یگانگت اور بے تعصی کے راگ کیسے الا پتے ہیں۔

ہم مُوحَّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزاءِ ایماں ہو گئیں
غالب کی شاعری انسانی دکھ اور خوشی کے امترانج کی شاعری ہے۔ انہوں نے اپنے خیالات میں اس
وسیعِ ملک میں بسنے والے لاکھوں انسانوں کی زندگی کی عکاسی کی ہے۔ ان کی شاعری کی عظمت اس بات میں
پہاڑ ہے کہ ان کی شاعری کی روشنی میں عوام اپنی تہذیب کی سمتیں متعین کرتی رہیں۔ ان کے خیالات بلند اور ان
کی نظر ہمہ گیرتی ہی۔ انہوں نے انسانیت کے لئے جو پیغام دیا ہے اس میں رنگ، نسل و مذہب اور ملت کی کوئی
تحصیص نہیں۔ انہی بنیادوں پر غلام رسول، میر، مرزا غالب کو انسانیت کا شاعر تصور کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:
”غالب کسی خاص گروہ خاص جماعت اور خاص قوم کے شاعر نہ تھے بلکہ اپنے دل و دماغ اور اپنے
تأثرات و احساسات کی ہمہ گیری کے باعث کائنات انسانیت کے شاعر ہیں اور یہی کیا کم اہم ہے۔“



سرور جہاں آبادی: اردو کا ایک اہم نظم گو شاعر

ڈاکٹر ندیم احمد

درگا سہائے سرور اردو نظم شعرا میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کی پیدائش ۱۸۷۳ء میں جہاں آباد ضلع پیلی بھیت میں ہوئی تھی۔ آپ کے والد حکیم پیارے لال کا شمار جہاں آباد کے رو سماں میں کیا جاتا ہے۔ سرور نے تحصیل اسکول جہاں آباد سے ورنہ کولڈل کا امتحان اول درجہ سے پاس کیا تھا۔ انگریزی زبان کی تعلیم غشی شیو سہائے سے حاصل کی اور انٹرنس کا امتحان بھی انگریزی مضمون کے ساتھ پاس کیا۔ علاوہ ازیں مولوی سید کرامت حسین بہار سے انھوں نے فارسی زبان پڑھی اور انھیں سے نظموں پر اصلاح بھی لینی شروع کر دی۔ ابتداء میں وہ وحشت تخلص کرتے تھے مگر بعد میں سرور کو کلیا جو تاحیات قائم رہا۔ ان کے شعری مجموعے 'وصال'، 'خون نا حق'، 'جام سرور' اور 'نخنا نہ سرور' ادبی حلقوں میں کافی مقبول ہیں۔ سرور شاعری میں نوعمری سے ہی دچکی لینے لگے تھے بھی وجہ ہے کہ اکثر شعری ذوق رکھنے والی شخصیات سے ہی وہ زیادہ رغبت رکھتے تھے۔ کچھ چھوٹی موٹی ملازمتوں کو ترک کرنے کے بعد انھوں نے خاندانی پیشہ طب اپنایا مگر شعری ذوق کی وجہ سے اسے زیادہ وقت نہیں دے پاتے تھے۔ اپنی اہلیہ اور اکلوتے بیٹی کی کم عمری ہی میں وفات کے بعد سرور کو یہ دنیا کسی کام کی نہ لگی اور اس غم کو بھلانے یا پھر تہائی دور کرنے کے لیے انھوں نے رندی کو گلے لگالیا۔ بھی وجہ ہے کہ ۳۷ برس کی عمر میں ۱۹۱۱ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

سرور کی مقبولیت اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ اردو ادب میں ہی نہیں بلکہ ہندوستانی ادب میں دچکی رکھنے والا کوئی بھی فردان کے نام سے نا آشنا نہیں ہو گا۔ وہ ایک لاکن و فائق شاعر تھے۔ انھوں نے اپنی محض رسی زندگی میں اپنے کلام میں وہ جو ہر، اور وہ رنگ پیدا کیے جوارہ کے چند نظم گو شعرا کے یہاں ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اصلاح نظم گو تھے مگر انھوں نے غزلیں بھی لکھیں مگر ان کی تعداد ناکے برابر ہے۔ سرور کی نظموں کو پڑھ کر یہ اندازہ بے آسانی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اردو نظم نگاری کی روایت میں ایک نئی داع بیل ڈالنے کے لیے ہمیشہ کوشش رہے اور اپنے اس مقصد کی حصول یا بھی میں بہت حد تک کامیاب بھی رہے ان کی نظموں میں تغزل کی شان و شوکت موجود ہے۔ ان کی زبان اس قدر سادہ سلیس اور رواں دوال ہے کہ قاری کو پڑھتے وقت ادبی مٹھاں کا احساس خود بخود پیدا ہوتا ہے ان کی نظموں میں یا اس نامیہدی اور قنونیت

کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ بار بار پڑھنے پر بھی یئی نئی سی معلوم ہوتی ہیں۔ انھوں نے نادر تشبیہات، استغارات اور علماتوں کے علاوہ نیچرل شاعری کے ذریعے اپنی نظموں میں ایسی حسین و جیل شعری فضا پیدا کی ہے جو انھیں قدیم نظام کو شعر اسے جدا کر کے اور ان کی عظمت کو مسلم کرتی ہے۔

ابتداء میں ان کی نظمیں اُنیس ہند، میرٹھ سے شائع ہوئیں مگر بعد میں اردو یعنی مسلم، مخزان، اور زمانہ جیسے رسائل میں باکثرت شائع ہونے لگے۔ رسالہ ادیب، سرور کو مقبولیت دلانے میں کافی اہم رہا ہے۔ ان کی تین مشہور نظمیں نیچرل شاعری، نور جہاں کامزرا اور بے شائق دنیا، اسی رسالے میں شائع ہوئیں ان نظموں سے اردو شاعری میں سرور کی انفرادیت اور ان کے مخصوص جدت بیان کو نئے زاویے سے نقایوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔

حالانکہ نیچرل شاعری کی ابتداء تو حالتی اور آزاد نے کی تھی مگر اس کو اور بھی تابتداء سرور نے بنایا، سرور کی نظموں میں فکرو بصیرت کے علاوہ بیانیہ کا وہ انداز ہے جو دیگر شاعر کے یہاں کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی بیشتر نظموں میں آہ، لفظ کو ایک اہم علامت کے طور پر بار بار استعمال کیا گیا ہے، جس سے ان کی طبیعت کے سوز و گداز کی جانب اشارہ ملتا ہے۔ سرور کی نظموں کے مطالعہ کے بعد یہ بات صاف طور پر کہی جاسکتی ہے کہ انھیں اپنے تجربات اور مشاہدات پر کافی اطمینان تھا جس کا استعمال انھوں نے جا بجا کیا اور جس موضوع پر بھی نظم لکھی ہے۔ اپنی دور رس نگاہ اور فکری پچشتگی سے اسے لازوال بنانے کی سعی کی ہے۔ ایک ہی موضوع پر لکھی گئی ان کی بیشتر نظموں میں بھی ذخیرہ الفاظ، تخلی کی بلند پروازی درد و سوز اور وقوفی تپش کو وہ جنم کر اور کھل کر استعمال کرتے ہیں اور ان کا یہی فن انھیں اردو کے اہم شعرا کی صفت میں شامل کرتا ہے۔

ان کی نظموں کو پڑھنے کے بعد اکثر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے بیشتر نظمیں خود تحریر کی ہیں مگر چند نظمیں دیگر زبانوں سے بھی ترجمہ کی گئی ہیں۔ ’کارزارِ تستی‘، جہاں میز پر کڑکی نظم کا ترجمہ ہے وہیں ’ریائے اکبری‘ میں لاڑ ڈینیں کی Dream Akbars کے کئی بندوں کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح کوئل، مرغابی، جننا، ترانہ ہند، حسرت دیدار اور سال ’گزشتہ‘ سب انگریزی نظموں کے تراجم ہیں۔ ’دیوار کہن‘ اور ’نایبا پھول والی‘ اور ’ملک اخزری‘ جیسی نظموں کا خاکہ بھی مغربی نثر سے لیا گیا ہے۔

سرور نے الگ الگ موضوعات پر نظمیں لکھیں مگر ان کی سب سے کامیاب اور مکمل نظمیں حب الوطنی پر کہی جاسکتی ہیں جن کی تعداد ۲۶ ہے، خاک وطن، ان کی پہلی حب الوطنی پر لکھی نظم ہے جس میں ہندوستان کی تاریخی عظمت کا احاطہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسری نظم سروں ’حب وطن‘ ہے تیسرا نظم کا عنوان ’مادرطن‘ ہے جو ان کی سب سے مقبول نظم ہے۔ ’اندوہ غربت‘ بھی اسی ضمن کی چوتھی نظم ہے جب کہ ’یاد وطن‘، ان کی چھٹی نظم ہے جس میں حب الوطنی کے جذبے کو نہایت اکساری کے

ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ حب الوطنی سے سرشار نظمیں ان کے سماجی اور اجتماعی شعور کی عکاس ہیں جن میں توازن کے ساتھ ساتھ سوچے سمجھے خیالات کی تصویر کی بھی کی گئی ہے۔ علاوه ازین عورتوں کے حالات، جذبات اور ان کی نفسیات پر بھی سرور نے کافی نظمیں لکھی ہیں۔ ان میں پدمنی، دمکن اور نہس، سیتا کی گریہ وزاری اور اداۓ شرم، میں انھوں نے ہندوستانی خواتین کی عظمت، ان کے احساسات اور ان میں موجود شرم و خوبی کے زیور کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ سوزیوگی اور فریاد بیوگان میں انھوں نے بیوہ عورتوں کی بیچارگی کی جانب سماج کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کافی سادگی سے کی ہے جس سے ان کے خیالات کی پاکیزگی کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ مذہبی امور پر بھی انھوں نے دلکشی جی، اور وید مقدس، جیسی اہم نظمیں لکھیں جن میں غصب کی سادگی اور روانی ہے۔

سرور کی شخصیت اور شاعری کا یہ وقت بھی توجہ کا طلب گار ہے کہ وہ ایسی جگہ پیدا ہوئے جہاں شاعری کے لیے کوئی وسیع میدان نہ تھا، کوئی اچھا استاد موجود نہ تھا۔ ماحول بھی غیر ادبی اور تعلیمی اعتبار سے ناموزوں تھا۔ زبان بھی دبلی اور لکھنے سے جدا تھی لیکن انھوں نے اپنی ذہنی کاؤش ذاتی مطالعہ اور مشق سخن کی کثرت سے اپنی زبان کو کوثر و تنیم کے چشموں کی مانند صاف شفاف اور چمکدار بنایا جس کی مثال ان کی نظموں کے ایک ایک مصريع میں دکھائی دیتی ہے۔ وہ زبان پر پوری گرفت و قدرت رکھتے ہیں اور مشکل سے مشکل خیالات کو سادگی بھرے انداز میں کچھ اس طرح کہہ دینے کا ہمار جانتے ہیں کہ جس کا اثر تادیری قائم رہتا ہے۔ تشبیہات اور صنعتوں کے استعمال میں وہ حد درجہ ماہر ہیں اور تمییز یہ احساس کرتے ہیں کہ ان کی مستعمل یہ ساری لفظیات انھیں کی ایجاد کردہ ہیں۔ اس کا بہترین نمونہ بیرونی نام کی وہ مشہور لفظ ہے جسے نیچرل شاعری کی عدمہ نظم ہونے کا بھی شرف حاصل ہے۔ سرور کے کلام کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر شے کو مرقع بنانے اور اسے حقیقی حسن عطا کرنے میں پوری طرح کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام کا ایک اور وصف جو انھیں دیگر شعرا سے ممتاز کرتا ہے وہ ان کا اعتدال اور ہم آہنگ مزاج ہے جس کی نسبت سے وہ خود کی ترجمانی کرتے ہیں اور اپنی شخصیت کے تمام تر پہلوؤں کو بنا کسی سجاوٹ کے نمایاں کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کا مختصر سارہ مایہ بھی اپنی کیف و سرمستی اور لطف و اثر کے دم پر ہمیشہ شعروخن میں دلچسپی رکھنے والوں اور نقادوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرتا رہے گا۔

آخر میں ہم سرور کی نظموں کے چند اشعار پیش کر رہے ہیں جن کے مطالعہ کے بعد ان کی شاعری کے جمالیاتی عناصر اور اسلوب بیان کو بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔

یاد طلبی:

برس گئی کوئی ٹھنڈی ٹھنڈی جھڑی
کبھی جو آئینے میں ایک یک
رہا ہوں پھر وہ میں محو حیرت

بھائی میں نے کاغذ کی ناویں
جو ساون کی آسمان سے
نظر پڑی مجھ کو اپنی صورت

سیتا کی گردی وزاری:

ریکھا تمہارے چزوں کی ہوں ساتھ لے چلو

ہمراہ بن کو ناٹھ مجھے ساتھ لے چلو



چھوٹا تمہارا ساتھ تو جی چھوٹ جائے گا

نازک ہے میرا شیشہ دل ٹوٹ جائے گا

نایبا پھول والی:

بچے یہ پھول بھی تو اسی سر زمین کے ہیں
یہ نخنے لال اسی نازنین کے ہیں
بازار حسن میں یہ گل اُترًا ابھی ابھی
آئے ہیں ماں کی گود سے اُٹھ کر ابھی ابھی
سوتا ہوا چمن ہے اُٹھا لائی ہوں ابھی
پھولوں کی انجمن سے اُٹھا لائی ہوں ابھی

فریاد پیوه:

خردا چھائی کچھ ایسی بن کے حسرت میرے پھولوں پر
کہ کلیاں رہ گئیں جو بن کے میرے آہ مر جھا کر
وہ نازک ہوں کہ ہے بارگراں پھولوں کا بھی زیور
بنایا آہ اپنا کاش غنم نے مجھے لاغر
کہ مجھ کو ڈھونڈتی پھرتی ہے بستر پر قضا میری



اردو افسانے کا ارتقائی سفر

سعید رحمانی

دیوان بazar، کلکٹ - ۱۷۵۳۰۰ (اویشا)

اردو ادب میں افسانے کی ابتداؤ کوئی ایک سو برس قبل ہوئی۔ اس مدت کے دوران اس میں نمایاں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ یہ تبدیلیاں رومانی، ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت جیسی تحریکات کے زیر اثر ہوئی ہیں۔ اگرچہ مردوخاتین افسانہ نگاروں نے رومانی اور سماجی نوعیت کے بہت سے افسانے لکھے مگر وہ اپنا کوئی عمدہ نقش نہیں چھوڑ سکے۔ اردو افسانوں کو اس وقت اعتبار ملا جب منشی پریم چند نے افسانہ لکھنا شروع کیا۔ ان کی تحریروں سے اردو افسانوں میں ایک خوشگوار فضा کا احساس ہونے لگا۔ کفن، اور پوس کی رات، ان کے مقبول ترین افسانے ہیں۔ اپنے آخری دنوں میں انہوں نے مختلف افسانہ نگاروں کے افسانوں کا انتخاب انجارے کے نام سے شائع کیا۔ اس انتخاب نے افسانوں کی مقبولیت میں نہ صرف اضافہ کیا بلکہ لکھنے کی تحریک بھی دی۔ ان کے بعد غلام عباس، منشو، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر اور چند دیگر افسانہ نگاروں کی بدولت اردو ادب میں افسانوں کا ایک سیلا بسا آگیا۔

افسانہ نگاروں کی دوسری نسل میں قرۃ العین حیدر، قاضی عبدالستار اور جو گندر پال کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اس طرح افسانہ نگاری کا یہ سلسلہ آج کی نئی نسل تک دراز ہوتا چلا آیا ہے اور اس دوسری نسل کے بعد شہرت پانے والوں میں زادہ حنا، پیغام آفاقی، سید محمد اشرف، سلام بن رزاق اور معین الدین جینا بڑے جیسے افسانہ نگاروں نے اس فن کو بلندی تک لے جانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

موضوع کے اعتبار سے ان افسانوں میں بڑا تنوع پایا جاتا ہے۔ زندگی کی مختلف عبارت کو بڑی خوبصورتی سے ان افسانوں میں پیش کیا گیا ہے۔ ان میں سماجی، سیاسی، اخلاقی، معاشرتی سمجھی پہلو نظر آتے ہیں مگر تقسیم ملک کے بعد جو افسانے لکھے گئے ان میں فسادات اور ظلم و تشدد کے واقعات حاوی رہے۔ گزشتہ صدی کے اوخر میں یہ افسانے صرف مسائل زندگی تک محدود ہو کر رہ گئے تھے جن کا ایک انتخاب مافیا کے نام سے پیغام آفاقی نے شائع کیا ہے۔ مگر معین الدین

جینا بڑے کافسانوی مجموعہ "تعییر" اور نیز مسعود کا مجموعہ طاویں چمن، دو ایسے مجموعے ہیں جن میں انفرادیت پائی جاتی ہے۔
افسانے کی تعریف:

ایڈگر ایلن پو کے مطابق افسانہ ایک ایسی نثری داستان ہے جس کو پڑھنے میں ہمیں نصف گھنٹے سے دو گھنٹوں تک کا وقت لگ سکتا ہے۔ اس نے مگر افسانے کے فنی اور تکنیکی پہلوؤں پر روشنی نہیں ڈالی۔ سامنست مام کو وقت سے بھی اختلاف ہے۔ اس کے خیال میں مختصر افسانہ پڑھنے کے لیے دس منٹ یا زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے کا وقت لگ سکتا ہے۔ ان دونوں قلمکاروں نے اگرچہ افسانے کی تعریف میں قدراً اختلاف کے ساتھ وقت کے لئے پر زور دیا ہے مگر اسی بات پر مزید غور کریں تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ افسانے کا مختصر ہونا ضروری ہے۔

افسانہ اپنے اندر ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک چکدار لفظ ہے۔ داستان، ناول اور مختصر افسانہ کسی پر بھی اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ بقول پروفیسر عبدالمحسن:

"یہ ایک نئی صنف ہے جو پچھلے سو برسوں میں مغربی ادبیات کے زیر اثر ہمارے یہاں رواج پذیر ہوئی۔"

اویس احمد ادیب نے بالکل درست کہا ہے کہ:

"کسی صفتِ ادب کی صحیح، جامع و مانع تعریف بہت مشکل ہے۔ ہر اہل قلم اپنی سمجھ اور قابلیت کے مطابق ایک علیحدہ تعریف پیش کرتا ہے۔"

مغربی مصنفوں کے علاوہ احمد اکبر آبادی، اختر اور یزنوی، پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر گیان چند جی بن، منٹو اور وقار عظیم نے بھی مختلف موقع پر افسانے کی تعریف میں جو خیالات پیش کئے ہیں ان کی روشنی میں افسانے کی خصوصیات کا لئین مندرجہ ذیل طریقے سے کیا جاسکتا ہے:-

(۱) افسانہ اتنا مختصر ہو کہ ایک ہی نشست میں ختم ہو جائے۔ (۲) قاری اس سے صرف ایک تاثر ہی قبول کر سکے۔

(۳) تاثر پیدا کرنے کے لیے اتحادِ زمان و مکاں اور کردار نگاری کا خاص خیال رہے۔ (۴) کہانی کسی مشاہدہ یا تجربہ پر بنی ہو یعنی حقیقت سے دور نہ ہو۔ (۵) اس میں ندرت، جامعیت اور لمحہ میں ہم آہنگی برقرار رکھنی چاہیے۔ لکشی کی خاطر شاعر انہ کیفیت بھی پیدا کی جاسکتی ہے۔ (۶) کہانی میں کلامکس (نقطہ عروج) کا ہونا لازمی ہے۔ (۷) کہانی میں فلسفیانہ یا جذباتی حقیقت کا اظہار بھی ہو۔

محولہ بالانکات سے ہمارے ذہن میں مختصر افسانے کا ایک ہلکا سا خاکہ ابھرتا ہے کہ داستان یا ڈرامے سے بہت

قریب ہونے کے باوجود افسانہ ان اصناف سے بہت مختلف ہے اور اس کی تکنیک اور ہدایت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ بہر حال اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ افسانے کو آج کافی مقبولیت حاصل ہے۔ اس کی ابتداءس دور میں ہوئی جب دنیا سائنس اور ٹینکنالوجی کے میدان میں بذریعہ ترقی کرنے لگی تھی۔ اس کے ساتھ صنعتی انقلاب نے زندگی کو اور بھی تیز رفتار بنا دیا تھا۔ اب لوگوں کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ضخیم ناولوں کا مطالعہ کر سکیں۔ وقت کی تنگ دلائلی ہی افسانے کی محکم بنی۔ شروع میں ناول کی طرح افسانے بھی فرضی اور ماقبل الفطرت جیسے موضوعات پر مبنی ہوتے تھے۔

مجنوں گورکپوری نے مشنوی کو بھی منظوم افسانے کا نام دیا ہے کیونکہ مشنویاں بیشتر ماقبل الفطرت واقعات، طسم، سحر، دیو، بھوت پریت کے قصے پیش کرتی ہیں۔ چنانچہ یہ ضروری سمجھا گیا کہ افسانے کو زندگی سے قریب کر کے اسے افادیت کا حامل بنایا جائے۔ اس ضمن میں پریم چند نے راہ دکھائی اور اپنے افسانوں کو دیہی پس منظر میں تعمیری رُخ عطا کیا۔

بہر حال تکنیک، اسلوب، موضوع اور کردار نگاری کے اعتبار سے نئی منزلوں سے گزرتے ہوئے افسانے کا یہ قافلہ بہت پیش رفت کر چکا ہے۔ اس نے اپنے گرد و پیش رونما ہونے والی خفیف سی بھی تبدیلی کی آہٹ محسوس کر کے قاری تک پہنچانے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔

ناول کی جگہ افسانے کی ضرورت کیوں پڑی؟ اس پر غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ پہلے لوگوں کو فراغت حاصل تھی اور وہ وقت گزاری کے لیے طول طویل ناول بھی اطف لے کر پڑھا کرتے تھے۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زندگی بھی تیز رفتار ہونے لگی۔ پھر صنعتی انقلاب نے لوگوں کو اتنا مصروف کر دیا کہ فراغت کے لمحے ان کی زندگی سے عقا ہو گئے۔ ایسے میں ضخیم کتابیں پڑھنے کے لئے ان کے پاس وقت نہیں رہا۔ اسی بات نے مختصر افسانوں کو جنم دیا۔ کم وقت میں اچھی چیز پڑھنے کے لیے افسانہ ایسا ہو کہ اختصار کے ساتھ ہی تفریغ بھی ہو جائے اور مسائلِ زندگی کی گرہ کشائی بھی ہوتی رہے۔ کردار نگاری، کہانی کی بہنیت اور اسلوب افسانے کے بنیادی اور فنی پہلو ہیں۔ جس افسانہ نگار میں یہ صلاحیت ہے وہ اپنے افسانے کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ اس میں کہی گئی باتیں زندگی سے قریب لگتی ہیں۔ یہی ایک سچے افسانہ نگار کی پہچان ہے۔

اردو افسانوں کا فروغ:

یہ بات پہلے کہی جا چکی ہے کہ اردو افسانے کا آغاز کوئی سو سال پہلے ہوا۔ اس قلیل مدت میں اردو افسانے نے جس تیز رفتاری سے ارتقائی منزلیں طکیں وہ یقیناً حیرت انگیز ہے۔ مشی پریم چند کو اردو کا اولین افسانہ نگار مانا جاتا ہے۔

بعض لوگوں کو اس سے اختلاف بھی ہے۔ تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ پریم چند کی طرز تحریر نے اردو افسانوں کو صحیح خود خال عطا کیا۔ ان کے افسانے فن کی کسوٹی پر پورے اُرتتے ہیں۔ ان کے پہلے جو افسانے لکھے گئے ان میں فنی لوازمات کی کمی یا بُری طرح ہٹکتی ہے۔ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ پریم چند کی تحریر نے اردو افسانوں کو اعتبار بخشنا۔ وہ مقصدیت کے قائل تھے۔ ان کے ہر افسانے میں کوئی تکمیری پیغام ضرور ہوتا ہے۔ انہوں نے بطورِ خاص نچلے طبقوں کی مشکلات کو پیش کیا اور زمیندارانہ نظام میں ان کے استحصال کی نشان دہی کی۔

ترقی پسند تحریر کے زمانے میں ہنگامی مسائل افسانے کا موضوع بنے جن میں خط بکال، ہندو مسلم فسادات، امیر غریب کا فرق اور مزدور طبقہ کی مشکلات کی عکاسی کی گئی۔ ان افسانہ نگاروں کی تحریر چونکہ اس وقت کے مسائل زندگی سے پوری طرح ہم آہنگ ہوتی تھی اس لئے قاری ان میں کشش محسوس کرتا تھا اور ان سے متاثر بھی ہوتا تھا۔ اس دور کے افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، سعادت حسن منشو، عصمت چغتائی، اوپندر ناتھ اشک، خواجہ احمد عباد اس اور دیوندر ناتھ ستیار تھی کاشمار ہوتا ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ افسانے کے موضوع میں تنوع پیدا ہوتا گیا۔ ان میں واردات حسن و عشق کی جگہ سماجی، سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی اثرات کا عمل دخل بھی ہونے لگا۔ افسانے کی تکنیک میں بھی تبدیلی ہوتی رہی۔ اس کی تکنیک میں نت نئے تجربے کئے جانے لگے۔ جدیدیت کے زیر اثر بیانیہ کی جگہ عالمتی افسانے بھی لکھے جانے لگے جو بڑھتے بڑھتے تحریری صورت اختیار کر گئے لیکن قاری نے ایسے افسانوں کو رد کر دیا کیونکہ نہ تو ان میں کہانی ہوتی تھی اور نہ ہی یہ افسانے ان کی سمجھ میں آتے تھے۔ افسانے کے لئے یہ ایک بحرانی دور تھا۔ جب قاری ہی نہ ہو تو پھر افسانہ لکھنے کا کیا فائدہ۔ مجبوراً افسانہ نگاروں نے پھر سے بیانیہ کی طرف مراجعت کی اور افسانے کا فن اپنی سابقہ پڑی پر آگیا۔ اس سے یہ بھی پتہ چل گیا کہ قصہ چاہے کسی بھی طرز پر لکھا جائے اس میں کہانی پن کا ہونا لازمی ہے۔ افسانوں کے بارے میں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ صرف تاریخی پس منظر کو پیش نہیں کرتے بلکہ ان کے اندر روح عصر کے ساتھ ہمارے دل کی دھڑکنیں بھی سُنی جاسکتی ہیں۔ اس طرح اردو کے یہ افسانے تہذیبی سرمایہ کا درجہ رکھتے ہیں۔



ماہیوسیوں کی گرد جمی ہے نگاہ پر

شارق عدیل

مارہرہ، ایٹھ، اتر پردیش

ان دنوں اردو شعروادب کی پُر بہار وادیوں پر ماہیوسیوں کے بادل چھائے ہوئے ہیں کیوں کہ محترم شاہد عزیز، کی نظر میں جو بھی معیاری ادب تخلیق ہونا تھا وہ ترقی پسند قلم کاروں کے ہاتھوں ہو چکا ہے، اور محترم عرش صہبائی کے خیال میں یہ دو رشاعری کا ہے ہی نہیں۔ محترم ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی سوچتے ہیں کہ ۱۹۸۰ء کے بعد کے شعرا میں صرف دو چار ہی شاعر ہیں اور محترم افتخار امام صدیقی کہتے ہیں کہ بیش برور ندا فاصلی کی طرح کون شاعری کر رہا ہے۔ ایسے گرد آلودہ ماحول میں نئی نسل کے شعری حوالے سے کوئی کیا گفتگو کرے گا جب کہ اس صداقت سے ہر اعلیٰ وادیٰ قلمکار و اوقاف ہے کہ شعروادب میں وقت کے ساتھ بہت سی تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں اور یہ تبدیلیاں ہی قلمکاروں کو مختلف ادوار میں تقسیم کرنے کا جواز فراہم کرتی ہیں۔

اس لیے ہر دور کے شعراء اپنے تمام تر مسائل و احتجاج کو اپنے ہی شعری انداز میں منظوم کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے لمحے میں شعر کہنے سے پرہیز کرتے ہیں، اگر ایسا نہیں ہوتا تو اکیسوں صدی کے شعراء میر و غالب کے اسلوبیات میں شاعری کر رہے ہوتے لیکن یہاں مزید کچھ کہنے سے قبل یہ سوچنا ضروری ہے کہ آخر کیا وجہ ہے جوئی شاعری سے متعلق صرف ماہیوسیں مدد ائیں ہی متواتر تکانوں سے گزر رہی ہیں۔ تو ان کے اسباب میں بھی نادری کا زہر ہی تیزتا ہوا نظر آتا ہے۔

کیوں کہ محترم شاہد عزیز اپنے وقت کے معتبر شاعر ہیں، کئی مجموعات کے خالق ہیں۔ تقیدی نظر بھی رکھتے ہیں لیکن ان کے کلام کے معنوی سمندر کی تہوں میں اُترنے کی زحمت کسی بھی ثقہ ناقد نے گوارہ نہیں کی جب کہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس ضروری شعری آواز کی اہمیت کی نشاندہی کی جاتی اور تقیدی حقائق کی روشنی میں اس کا بغیر کسی مصلحت کے اعتراض کیا جاتا مگر ایسا نہیں ہوا کیوں کہ گروہی جکڑ بندیوں میں گھری ہوئی تقید اپنے منصب و وقار کی ذمہ داریوں سے بھی بے خبر بی ہوئی ہے۔

تو ایسی صورت حال میں تخلیقی فضاً امید افزاء کیسے نظر آ سکتی ہے۔ محترم عرش صحابی کا مسئلہ بھی اس سے مختلف نہیں ہے، اور اس صداقت سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ وہ ایک کہنہ مشق شاعر ہیں اور فن پر بھی مکمل دسترس رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی صوبائی تعصب کا شکار ہے ہیں جب کہ ان کی شاعری میں حال و ماضی و مستقبل کی معنوی تصویریں نمایاں نظر آتی ہیں مگر مسئلہ بھی ہے جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، اور ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی، غیر گروہی ناقد کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کر چکے ہیں۔ جب انہوں نے نئی نسل پر لکھنے کا ارادہ کیا تو انہیں زبان و بیان کے اعتبار سے ایسے لگڑے لوے اساتذہ کی تیار کی ہوئی شعراۓ کی فوج نظر آتی جو شاعری کے ابجد سے بھی انجام تھی۔ تو ایسی صورت میں انہیں کہنا ہی تھا کہ نئی نسل میں دوچار کے علاوہ کوئی شاعر نہیں ہے اور اگر وہ فرضی شعراۓ کی بھیڑ سے پنج کر اصل شعراۓ کی تحقیق کی طرف نکل جاتے تو یقیناً مایوسی کی کوفت سے پنج جاتے لیکن محترم افتخارات امام صدیقی نئی نسل سے کیوں مایوس ہیں۔ یہ سوال ضروراً بجھن میں ڈال دیتا ہے۔

کیوں کہ انہوں نے اپنے ماہنامہ 'شاعر' میں ہمیشہ ہر اعتبار سے نئی نسل کی حوصلہ افزائی کی ہے اور وہ اپنی دیرینہ روشن پر صدق دل سے آج بھی قائم ہیں۔ پھر بھی انہیں نئی نسل کی غزلیہ شاعری میں ایک مصرع بھی ڈھنگ کا نظر نہیں آتا۔ یہ کیسا تضاد ہے اور ابھی تو خیر سے جدید شعراۓ کی اچھی خاصی تعداد بھی ہمارے درمیان موجود ہے، اور بہترین تخلیقی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ میں یہاں ناموں کا پہاڑ بنانے سے گریز کرتے ہوئے صرف ان شعراۓ کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جو حقنوناقدین کی نگاہوں میں سماچکے ہیں۔

فرحت احساس	وہ آئینے میں تو بس مختصر سارہتا ہے	بڑا اوسعیج ہے اس کے جمال کا منظر
ریفت راز	خن کے شہر میں کتنے ہیں اجنبی ہم لوگ	ہمارا طرزِ بیان ہے الگ جدا اسلوب
ڈاکٹر فرید آزر	رُکے تو پانو سے آگے نکل گئیں صدیاں	چلے تو فاصلہ طے ہونہ پایا لمحوں کا
پروین کمار اشک	مکاں خالی ہو ا جب ساتھ والا	بہت رویا ہوں دیواروں سے مل کر
شاہد جمیل	کہ اس گلی میں کوئی خود کو جانتا ہی نہیں	اُداس بیٹھا ہے آئینہ بیچنے والا
شین کاف نظام	شجر پر ایک بھی پتہ نہیں ہے	کہاں جاتی ہیں بارش کی دعائیں
جننا پر شادر ای	پر چھائیں کس کی آئینے مجروح کر گئی	دیوارِ اختیاط سے بہنے لگا لہو
شیشم طارق	انسان ہیں وراشت میں خطا ہم کو ملی ہے	ناکرده گناہوں کی سزا ہم کو ملی ہے

مذکورہ شعرا کی تخلیقی گلیوں میں بس ایک پھیر الگ کر دیکھیے ساری مایوسی ہوا ہو جائے گی کیوں کہ غزل ان کے موضوعی آنکھوں میں آج بھی پورے معنوی ثباب کے ساتھ اٹھلاتی پھر رہی ہے اور اپنی دفریب اداوں سے اپنے قارئین و سامعین کے دلوں کو مسحور کر رہی ہے تو ان شعرا کو بشیر بدر یا ندafa ضلی کی طرح شعر کہنے کی ضرورت ہے۔ اس میں کوئی دورانے نہیں ہے کہ جدیدیت نے ایک ہی وقت کئی عمدہ اور صاحبِ اسلوب شعراء اردو زبان کو عطا کیے ہیں، اور ان میں ہی بشیر بدر اور ندafa ضلی بھی شامل ہیں۔ بشیر بدر مشاعروں سے روپیہ کمانے کی دھن میں یا اپنے سامعین کو فضول رجھانے کی کوشش میں اپنے فکر و فون کے ساتھ سمجھوتا بھی کر لیا کرتے تھے لیکن ندafa ضلی اپنے کلام کو مشاعروں میں بہت ہی سنجیدگی کے ساتھ پیش کیا کرتے تھے، اور آزادِ نظمیں بھی پورے حوصلے کے ساتھ پڑھا کرتے تھے اور تخلیقی اعتبار سے بھی کئی اصنافِ سخن میں اپنے ہونے کا ثبوت مہیا کراتے تھے جب کہ بشیر بدر، غزل کی انگلی چھوڑنے کے خیال سے بھی خوف کھاتے تھے، کیوں کہ ان کا ترجمہ اور مصرع تخلیق کرنے کا انداز غزل کی کاشت کے مطابق تھا۔ اس لئے پیشتر غزل کے سامعین ان کے سحر زدہ لمحے میں کھو جایا کرتے تھے۔ مثلاً

مرے ساتھ جگنو ہے ہمسفر مگر اس شر کی بساط کیا یہ چراغ کوئی چراغ ہے نہ جلا ہوانہ جھاہووا
بیشیر بدر، سے قبل شاید ہی کسی شاعر نے جگنو کو اس معنویت کے ساتھ نظم کیا ہو، لیکن غور کرنے پر محسوس ہوتا ہے کہ شعر تقدیمی گرفت میں ہے۔ شعر کے اولیٰ مصرع کے ابتدائی مکملے کو دیکھیے ”مرے ساتھ جگنو ہے ہمسفر“ جب یہ کہہ دیا کہ مرے ساتھ جگنو ہے تو پھر ہمسفر ایسے لفظ کو برتنے کی ضرورت تھی۔ یہ تو بشیر بدر، ہی بتاسکتے ہیں، کیوں کہ ان کی شاعری کا ایک بڑا حصہ اس طرح کی اغلاظ کو اپنے دامن میں سمیٹ کر چلتا ہے، اور ویسے بھی اس شعر کے اندر گماں مطلع کا عیب موجود ہے۔

لیکن ندafa ضلی، اپنی تخلیقی رہ گزر میں سنبھل سنبھل کر قدم بڑھایا کرتے تھے۔ اس کے باوجود بھی ان کے بعض اشعار پر زبردست تقدیمی حملے ہوئے ہیں۔ مثلاً

مسجد سے اٹھ کے سارے نمازی چلے گئے دہشت گروں کے ہاتھ میں اسلام رہ گیا
تاریخ اور ادب کا بڑا گہرا رشتہ ہے کیوں کہ ہر دور کا ادب تاریخ کو صداقت کا آئینہ بنانے کی کوشش کرتا ہے لیکن تحریر کردہ شعر کی معنویت گمراہ کن ہے اور اسلام ایسے امن پسند نہ ہب کے اوپر ایک بھونڈی تہمت کے سوا کچھ نہیں ہے اور شعر کے دونوں مصراعوں کا آپسی تال میل بھی کمزور ہے۔

پھر بھی یہ دونوں شعرا، اپنے عہد کے بہترین شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ کیوں کہ ان کی تخلیقی امنگ میں جو شعری فکر کی نمود ہے وہ ہی انھیں دوسرے شعرا سے علاحدہ کرتی ہے لیکن ان دونوں شعرا کے شباب کے زمانے میں ایک شاعر اور بھی تھا۔ جسے اردو دنیا آشافتہ چنگیزی کے نام سے جانتی تھی، جانتی ہے لیکن اب ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے اسے نظر انداز کرنے کا ڈھونگ جان بوجھ کر کیا جا رہا ہے۔ پتہ نہیں یہ زمین اسے کب اور کہاں نگل گئی مگر اس کی شاعری آج بھی زندہ ہے اور اپنے قارئین کے حافظوں میں مسلسل ہمک رہی ہے۔

اپنے وعدوں سے سب مکر جائیں عجیب حال تھا دریا میں بہنے والوں کا آشافتہ چنگیزی	اب کسے روٹھنے کی فرصت ہے زبانیں پیاس سے باہر کو نکلی پڑتی تھیں
---	---

یہ اشعار شاہد ہیں کہ ہر دور میں صرف چند آوازوں نے ہی پورے ادبی معاشرے کو اپنی طرف راغب کرنے کے کمال کو آئینہ کیا ہے۔ فرق ہے تو صرف اتنا کہ فیس بک، واٹس ایپ، انٹرنیٹ کے اس دور میں رسائل کی اشتاعت کو مکمل معیار کے ساتھ برقرار رکھنا دو بھر ہو گیا ہے، اور یہ صورتحال ہی نیم پختہ قلم کاروں کے لیے فائدے مند ثابت ہو رہی ہے کیوں کہ یہ اپنی چرب زبانی اور بھرے ہوئے ہاتھوں کی بناء پر ادب کی ایسی پروقار محفلوں میں بھی شور مچاتے ہوئے مل جاتے ہیں۔ جہاں ان کی موجودگی ہی ادب کے دیوالیہ پن کی مثال بن جاتی ہے، اور اس کے برعکس نئی نسل کے قابل ذکر فنکار ناقدری کا درد دلوں سے باندھے ہوئے تخلیقی را ہوں میں سفر کر رہے ہیں۔

لیکن گروہی شعرا کی بھیڑ بھاڑ میں یہ معصوم کسی کو نظر ہی نہیں آتے ہیں، اور اگر بھولے سے کسی تنقید شہنشاہ کی نظر ان پر پڑ جاتی ہے تو وہ ان سے پہلی فرصت میں ہی مایوس ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ کوئی بھی سچا فنکار بستہ برداری کے ہمراستے آشنا نہیں ہوتا ہے، اور یہ بات ہی تنقید کے خداوں کو پسند نہیں ہے، اور اگر یہ بات نہیں ہے تو یہ لوگ نئی نسل کے تخلیقی وجود سے انکار کرنے میں کیوں لگ رہتے ہیں؟

شاید محترم افتخار صدیقی بھی گروہی ناقدرین کی بے بنیاد باتوں کی زد میں آگئے ہیں، لیکن ان بھی نئی نسل سے اس قدر مایوس ہونے کا وقت نہیں آیا ہے۔ کیوں کہ اس میں اب بھی ایسے غزل گوسانیں لے رہے ہیں جنہوں نے غزل کو فتنی اعتبار سے بھی اپنے عہد کا حوالہ بنادیا ہے، اور غزل کی بیعت کا احترام کرتے ہوئے اس طرح کے تجربات کیے ہیں جو قاری کو چونکا تے ہیں:

اندھیرے رقص کناں ہیں چراغ روشن کر
کچھ ایسا ساقی دوراں ایا غ روشن کر
مذکورہ غزل کی تخلیق میں اس تجربے کو زندگی عطا کی گئی ہے کہ پوری غزل کو پڑھ جائیے لیکن کسی بھی مقام پر
ہونٹ ایک دوسرے کو چھونے کی جسارت سے محروم ہی رہیں گے اور غزل کے تمام اولیٰ مصارات بآہم مقنی ہیں۔ ڈاکٹر
اسلم حنفی کی غزل میں اور بھی عروضِ فن اور قوافی سے متعلق ایسے تجربات کو دیکھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے جن کا مطالعہ
قارئین کو استنباطی کیفیات سے ہمکنار کر دیتا ہے۔

اس لئے میں نیشنل کی تحقیقی صلاحیتوں سے مايوں ناقدین سے کھوں گا کہ مايوں کے اندھیرے سے باہر نکل
کر دیکھیں۔ بہت سے شعراء غزل کو نئے معنی و مفہوم سے قریب کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔

نکلا ہے شفق رنگ شر اپنی طرح کا خورشیداً کبر
دعائے خیر بھی مانگے کوئی شجر کے لئے عالم خورشید
تمام چیزوں پہ بھاری پڑی تھکن اس بار تفضل احمد
مجھے تو یوں بھی یہ صحرا عبور کرنا تھا شہرام سرمدی
چراغ راہ کی مانند میں مدھم نہیں ہوتا جمال اویسی
فی الحال ہو سکے تو بدن کی نوید بھیج نعمان شوق
مگر جو دل کو تھا، اک دل سے رابطہ نہ رہا سہیل اختر
ہاں، مگر بیچ کی دیوار بھی رہ گئی ہے ضیافاروی
پھر ہوا یوں کہ عبادی کبھی راحت نہ ہوئی خالد عبادی
تیغ پہ خون سے لکھا ہوا الفاظ ہیں ہم طارق قمر
لہو آمیز پھر بولتے ہیں ملک زادہ جاوید
سبھی انسان پتھرائے ہوئے ہیں سردار سلیم
یہاں پر ذکر مت کیجئے اماں کا ڈاکٹر منصور خوشتر
کیا انھیں لگاتا ہے زہر یلا پوکھرا کا کالا پانی مشرف محضر

تحریر کردہ اشعار کی معنوی کلکاریوں میں عصری زندگی کی بوس پوری طرح بسی ہوتی ہے، اور اسلوبیات کے حوالے سے بھی تمام اشعار ایک دوسرے کی مخالف سمت میں گھڑے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔

اگر زندگی کے بدلتے ہوئے مزاج کو سامنے رکھ کر نئی غزل کے موضوعاتی پھیلاو پر غور کیا جائے گا تو یقیناً یہ اپنے وجود کے کسی بھی پہلو سے مایوس نہیں کرے گی، اور ڈاکٹرا یحییٰ نسیمِ اعظم کے خیال کو درست ثابت کر دے گی:

اب چھوڑ دے حساب پُرانے نظام کا
کچھ عصری اگھی کا بھی میزان بن کے دیکھ

اور ۱۹۸۰ء کے بعد کی شاعری کو پرکھنے کے لیے مذکورہ شعراء کے ہم عصر شعراء کی طرف بھی دیکھنا پڑے گا، تب کہیں جا کر کوئی ثابت نتیجہ سامنے آنے کی امید ہو یا ہوگی، جس کے لیے فی الحال تو کوئی ثقة ناقد تیار نہیں ہے کیونکہ یہ ایک سوچ سمجھا منصوبہ ہے کہ نئی نسل کے معقول و اہم شعراء کی تخلیقی کا وشوں کو اس سفرا کی کے ساتھ نظر انداز کرو کہ وہ بے اطمینانی کی دلدل میں ہنسنے چلی جائے۔

مگر ایسا کرنے سے قبل شعروادب کے ٹھیکیدار یہ کیوں نہیں سوچتے ہیں کہ ایک مدد تک نظر انداز کیے جانے کے بعد بھی نظیراً کبر آبادی، ایسا عوامی شاعر نہیں مرسکا تو پوری ایک نسل کیسے مر جائے گی ۔
ہماری نسل کا سب سے ہے منفرد اسلوب نہ ہم میں میرے ہے کوئی نہ کوئی غالبہ ہے



تخفہ

ڈاکٹر شاہد جمیل

رحمن ہاؤس، گراونڈ فلور، ۲۷، روڈ نمبر ۱/ڈی، پٹلی پتھر کالونی، پٹنہ، ۸۰۰۰۰۸، (بہار)

Mob. 09430559161-0825296137, Email.: drshahidjamilpatna@gmail.com

وہ اس طرح کھارہاتھا جیسے ماں بچے کو کھلاتے ہوئے خوبی بھی کھاتی ہے۔ اچانک ایک خوبصورت تلتی کمرے میں داخل ہوئی اور چلر لگا کر ٹیوب لائٹ کے نزدیک جا بیٹھی۔ پھر وہ دھیرے دھیرے پنکھہ کھولنے بند کرنے لگی۔ ٹیوب لائٹ کی پستی میں ڈبکی چھپکلی دبے پاؤں تلتی کی جانب بڑھنے لگی۔ اُس کا وارخالی گیا۔ اُس کی گرفت میں آیا پنکھہ کا ایک چھوٹا سا مکملرا، جسے کھا کر اُس نے زبان سے منہ صاف کر لیا۔ اس بار تلتی دوری بنا کر بیٹھی۔ چھپکلی سرعت سے اُس کے بہت قریب پہنچ کر ٹھہر گئی۔ پھر وہ چیتے کی طرح فاصلے کو کم کرنے لگی۔ روشنداں میں بنائے گھونسلے میں چوزے رہ رہ کر ”چین، چین“ کر رہے تھے۔ اچانک گوریتا اُڑی اور چوچ میں تلتی دبائے گھونسلے میں لوٹ گئی۔ چوزے فائح ماں کا ”چوں، چوں“ کر کے استقبال کرنے لگے۔ وہ پھر اُڑی اور دیوار کے ایک کونے سے جاٹکرائی۔ اس بار وہ چوچ میں مکڑی دبائے گھونسلے میں لوٹی لیکن اُس کے تن سے ایک نرم پنکھہ جدا ہو گیا تھا، جو اکمن کے پھاہے کی طرح اُڑتا ہوا قورمے کے پیالے میں گرنے ہی والا تھا کہ میں نے پھونک مار دی۔

میری پھونک پروہ خیالوں کی وادی سے لوٹ آیا۔ خفت مٹانے کے لئے اُس نے تندوری چکن کا ایک بڑا سا مکملرا میری پلیٹ میں رکھ کر سلااد کی طشتیری میری جانب کھسکا دی۔ پھر وہ مٹی کی پیالی میں جمی فرنی کو اٹھا کر شہادت کی انگلی سے کھانے لگا۔

اچانک مجھے ہچکی آنے لگی، تب اُس نے جلدی سے پانی بھر کے گلاس مجھے پکڑا دیا۔ پانی پیتے ہوئے میں نے اُسے گلاس کے بالائی حصے سے دیکھا تھا۔ مجھے اُس کا چہرہ گرداب میں پھنسی کشی کے ناخدا سا گا۔

وہ ڈائنگ ٹیبل پر فرنی کی خالی پیالی رکھ کے اٹھ گیا۔ اُس کے اٹھ جانے کے بعد ساتھ کھانے کا لطف جاتا رہا۔ مجھے ہٹل کا کھانا، ہٹل میں ہی اچھا لگتا ہے۔ اچانک مجھے اُمی کی کہی باتیں یاد آگئیں کہ بیوی شریف، محبت والی و سلیقہ مند اور مہماں نواز ہوتو گھر جائے سکون ہوتا اور سجا سنوار رہتا ہے۔ وہ شوہر کا مان بڑھانے کے لئے ضیافت کو یاد گار بنا دیتی

ہے۔ عورت ہی مکان کو گھر بناتی ہے، جسے بچے گلزار رکھتے ہیں۔ فرنی کھاتے ہوئے میں نے سوچا کہ شادی بیاہ میں فرنی کی جگہ آئس کریم اور ما قوتی نے لے لی ہے۔ بعض مسلم ہوٹلوں نے ہی فرنی اور کھیر کے چلن کو جاری رکھا ہے۔ میں بھی جلدی سے فرنی کھا کر ڈائینگ ٹیبل سے اٹھ گیا۔ وہ ڈائینگ ہال میں ہی چہل قدمی کر کے صوف پر میرے پہلو میں آبیٹھا اور سکریٹ پیش کر کے لا یٹر کی لو میرے سامنے کر دی۔ اُس نے دو لمبے کش لگا کر سرخ حصے کو بغور دیکھا۔ نہ جانے کس خیال کے زیر اثر وہ اٹھا، سامنے والی کھڑکی تک گیا اور نیم واپر دے کوبرا بر کر دیا۔ پھر اندر گھس آئیں بیلوں کو اُس نے سلاخوں سے باہر کر کے ڈور کو ایک جھٹکے سے کھینچ دیا۔ پردے کے دونوں سرے چھڑے دوست کی طرح ہم آغوش ہو گئے۔ دو انگلیوں کے درمیان دبادھویں کی منہنی لیکر بناتا سکریٹ کا مردہ حصہ سیالابی کشاو کی زد میں آئے مٹی کے تودے کی طرح ڈھیہ گیا۔ اُس نے سرخ حصے کو دیکھا۔ پھر وہ ایک لمبا کش لگا کر دھوئیں کے چھلے بناتا ہوا میرے قریب آیا اور کندھے پر ہاتھ رکھ کے بولا، ”یا! کوئی نہیں جانتا۔ اُسے بھی معلوم نہیں ہو گا کہ پونم کی اُس رات کے واقعے کا میں تھا چشم دید گواہ ہوں.....“

اُس نے ایشٹرے میں سکریٹ کی گردان ٹرور دی۔ میں نے بھی جلدی جلدی دو تین کش لگا کر سکریٹ کو بجھاتے ہوئے کہا، ”اب میں ہم تین گوش ہوں۔“ ”ابھی آیا۔“ یہ کہہ کر وہ خواب گاہ میں چلا گیا۔

تحوڑی دیر بعد وہ لوٹ کر ڈائینگ ٹیبل سے جوٹھے برتوں کو بیرے کی طرح سمجھنے لگا۔ جب وہ برتوں کو لے کر کچن میں گیا، تب میں نے بھی نقری ڈیلوں اور پولی بیگ کو لیتے ہوئے کچن میں رکھے ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔ کچن کی حالت ابتر تھی۔ چینی اور پتی کے ڈبے کھلے پڑے تھے۔ ٹی پاٹ پر رکھے چائے پھٹنے میں پڑی پتی خشک ہو چکی تھی اور سنک میں پہلے کے بھی جوٹھے برتن پڑے تھے۔

ہم لوگ ساتھ ساتھ کچن سے لوٹے۔ وہ سیدھے کھڑکی تک گیا اور پردے کی ڈور کھینچ دی۔ بیلیں پھر اندر آ گئیں۔ چاند کا دور در تک پتا نہیں تھا۔ آسمان پر ستاروں کی حکمرانی تھی۔ نہ جانے کیوں وہ خلا کو گھوڑا تارہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ میرے پہلو میں آبیٹھا۔ پھر وہ میری ران پر دھول جما کر بولا، ”یا! بعض دو شیرا میں بڑی چالاک ہوتی ہیں، جب کہ بیشتر معصوم و نادان۔ یہ واقعہ اُس وقت کا ہے، جب کھوجی پتکاروں میں میرے نام کی دھوم تھی۔ میں بھی جاسوسوں کی طرح حصولِ مقصود میں لگا رہتا تھا۔“

اُس رات بے پی چوک پر میرے علاوہ سبھی مسافر اُتر گئے، تب آٹھ کشادوالے نے آگے چلنے سے صاف انکار کر

دیا تھا۔ گیارہ نج روہا تھا۔ دوسری سواری ملنے کی امید کم تھی۔ تقریباً ایک کیلو میٹر کا فاصلہ بجا تھا۔ میں پیدل ہی گھر لوٹ رہا تھا کہ اچانک مجھے ایک موہوم انسانی ہیولا نظر آیا جو امبیڈ کر لین سے نکل کر تیز قدموں سے سڑک پار کر کے نوآباد علاقے کی جانب جا رہا تھا۔ پھر دس پندرہ گز کا محتاط فاصلہ بنائے دوسرا سایہ اُس کا تعاقب کرتا ہوا مجھے نظر آیا۔ میری جاسوسی رگ پھر ک اٹھی تھی۔

اُسی راستے میں آگے چل کر ایک بہت پرانا تالاب ہے، جس کے بارے میں مشہور ہے کہ کسی نے ایک کم سن لڑ کی کی آبروریزی کے بعد مردہ سمجھ کر اسے تالاب میں پھینک دیا تھا۔ اُس واقعے کے بعد سے یہ تالاب ہر سال کسی نہ کسی کی جیولی لیتا ہے۔ اسی سبب وہ بھٹھتا تالاب کھلا تا ہے۔

تقریباً دس پندرہ سال قبل ملازمت پیشہ چند بگالیوں نے داشمندی سے کالی باڑی سوسائٹی قائم کر کے بھٹھتا تالاب سے مُصل زمین کا ایک بڑا حصہ کوڑی کے بھاؤ خرید لیا تھا۔ سوسائٹی نے رہائشی مکان کی تعمیر کے ساتھ لپ تالاب ایک عالی شان کالی مندر کی تعمیر بھی کروائی تھی۔ مندر سے تقریباً پانچ چھوٹو سو گز کے فاصلے پر وقف کردہ ایک وسیع قبرستان ہے، جو کھجور کے پیڑوں کی کثرت کے سبب کھجور بنا قبرستان کھلاتا ہے۔ تمام پیڑوں میں نیم کے چھترنار درخت کی حیثیت ممتاز ہے۔ اسی کے نیچے نمازِ جنازہ ادا کی جاتی ہے۔ جب بگالیوں نے کالونی بسائی، تب مسلمان محرک ہوئے اور انہوں نے بھی قبرستان سے کچھ دور ہٹ کر آزاد گنگرا لوٹی بسائی اور.....”

تاریخی و جغرافیائی تفصیل سے اکتا کر میں اچانک اٹھ کھڑا ہوا، تب وہ خاموش ہو گیا۔ پھر قدرے توقف کے بعد اُس نے پوچھا، ”بس ہو گیا؟ نہیں سنو گے؟“

”یار! مجھے کالی مندر اور کھجور بنا قبرستان سے کیا لینا دینا۔ میری دلچسپی کا مرکز فقط وہ حسینہ ہے، جس کا واقعہ سننے میں آیا ہوں۔“

”درائل میں تمہیں بتانا چاہتا تھا کہ بگالی دوراندیش، متحد اور مادری زبان کے محافظ ہوتے ہیں۔ مشہور کالی کینسر سنسٹھان، کالی آئی کیسٹرینٹ اور بگال ٹائیگر اخبار اُسی مندر کی آمدی اور ٹیلینٹ ڈنیشن سے چل رہے ہیں۔ دوسری طرف بیشتر متولی وقف کی جاندار کو باہم ہو گیوں سے اونے پونے نقیحہ دیتے یا پھر ڈولپمنٹ کے نام پر بااثر اور رسون خارا فراد تجارت کرنے لگتے ہیں۔ سروے کرو تو معلوم ہو گا کہ مسلمان اور ہندو دونوں مل جل کر قبضہ جمائے بے شرمی سے اپنا کاروبار چلاتے ہیں۔ شہر میں جتنے موڑ گیراج ہیں اُن میں زیادہ تر وقف کی زمین پر چل رہے ہیں۔ قاضی سرائے چوک کی جامع مسجد کے کمٹے کا کرایہ آج بھی دس روپیہ ہے۔ سُنی اور شیعہ وقف بورڈ کے حکام نے ذاتی مفاد میں آمدی بڑھانے اور روزگار فراہم

کرنے کے نام پر حصار بندی کے ساتھ ساتھ مار کیتہ بنا کر قبرستانوں کی شاختہ ہی ختم کر دی ہے.....”
پھر اُب کر میں نے قطع کلام کیا، ”ہر شخص کو اپنے کرتوت کی سزا ملتی ہے۔ یہاں نہیں، تو وہاں۔ یا! اب تم جلدی
سے واقعہ کو مکمل کرونا کہ دس نجی چکا ہے۔“

”ہاں! میں کیا کہہ رہا تھا؟“ اُس نے خود کلامی کی۔

وہ سُنائی باتوں کو از سر نو سُننا نا شروع نہ کر دے، اسی خوف سے میں نے کہا، ”بھختہا تالاب، کالی مندر اور کھجور بیٹا
قبرستان کی تفصیل تم سُنا چکے ہو۔ میں بتاتا ہوں۔ ایک انسانی ہیولا کو سڑک پار کرتے ہوئے اور دوسرے کو اُس کا تعاقب
کرتے ہوئے تم نے دیکھا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوا، یہ بتاؤ۔“

وہ جھلاؤ کر بولا، ”ٹھیک ہے جب تم ٹھیس فرست ہو گی، تب میں سناؤں گا۔“

میں نے فوراً انتباہ کی، ”نبیس یا! آج ہی سنادو۔ آدمی ادھوری با تین ٹیشن پیدا کرتی ہیں۔ مجھے نیند نہیں آئے
گی۔ ہاں! وہ سایہ اور اُس کا تعاقب کرنے والا کہاں گیا؟“ میں نے سراپکڑا یا۔

”دونوں آبادی سے دور، آزادگر کے ایک نیزیر تعمیر مکان میں لگھے تھے۔“

”اُس کے بعد کیا ہوا؟“ میں نے بے تابانہ پوچھا۔

”وہ سب کچھ، جو وہم و مگان سے پرے تھا.....“

”لیعنی؟“ میری نگاہیں اُس کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔

”پہلے سائے نے سیاہ چادر اُتار کر فرش پر رکھا۔ چاندنی رات میں وہ تراشیدہ ہیرے کی طرح دکنے لگی تھی۔ اُس
کی سانسیں ناہموار تھیں۔“

”اور دوسرے کون تھا؟“ تجسس مجھ سے دو قدم آگے آگے چل رہا تھا۔

”وہ ایک خوب رو گھیلانو جوان تھا۔ اُس نے اپنی چادر بچھا کر کہا تھا، آؤ! یہاں بیٹھ جاؤ۔“

وہ اُس کے قریب جا بیٹھی۔ پانی کا بوتل اُسے پیش کرتے ہوئے اُس نے کہا، ”تھوڑا سا پی لو۔“

اُس نے گھونٹ گھونٹ پانی پی کر پوچھا، ”کسی نے ادھر آتے ہوئے ہمیں دیکھا تو نہیں؟“

”نبیس۔“ اُس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

”اگر کسی کی نظر پڑ جاتی تو؟“ تم نے اس وقت یہاں ملنے کی بچکانہ ضد کی ہے.....“

وہ تنگ کر قطع کلام کرتے ہوئے بولا، ”کیوں نہ کرتا؟“

”مسٹر پریکی! پریم تیاگ اور بلیدان مانگتا ہے۔“ وہ اُس کی ناک پکڑ کے ہلاتے ہوئے بولی۔

”لیکن میں آئیڈیل لورنیں۔“ اُس کا لبھ سخت تھا۔

”کیا تم مجھ سے سچا پریم نہیں کرتے؟“ اُس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

”کرتا ہوں۔ لیکن.....“ وہ نظریں چرانے لگا۔

”لیکن کیا؟“ اُس نے تشویشناک لبھ میں پوچھا۔

”تمھارے خوب صورت جسم کو میں کسی اور کے خواں نہیں کر سکتا۔“ وہ بے باکی سے بولا۔

”ہم لوگوں نے تو ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ لیکن.....“ وہ افسر دہ لبھ میں بولی۔

وہ بھڑک کر بولا، ”لیکن کیا؟ تمھارا بھائی پریم شترو ہے۔“ اُس کا آکروش چہرے پر نمودار ہو گیا تھا۔

”صرف اُن کا قصور نہیں۔ تمھارے گھروالے بھی تو راضی نہیں ہیں۔ یا ر! سماج ہمیشہ دھرم، جات پات اور امیری غربتی کی دیوار کھڑی کرتا رہا ہے اور عاشقوں نے بھی بلیدان دیا ہے۔ ہم بھی کیوں نہ اسے بھاگلیہ کا لکھا سویکار کر لیں.....“ اُس نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا تھا، ”کیوں سوپا کر کر لیں؟ میں اُن پریموں میں نہیں، جو پریم کا دان کرتے.....“

”سبھتے کیوں نہیں؟ مجبوری ہے۔“ اُس نے گال تھیپھا کر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”تم سمجھتی ہو کہ میں براتیوں کا سوا گستستہ کروں گا؟ دو لمحے راجا کو سینے سے لگا کر مبارکباد پیش کروں گا؟“ اُس کا لہجہ ترش اور استہزا تھا۔

لڑکی کچھ دیر تک خاموش رہی۔ پھر اُس نے اچاکنگنگلو کا موضوع بدلتے ہوئے پوچھا، ”اچھا بتاؤ! تھیں میرا کون سا آنگ پسند ہے؟.....“

”رسیلے ہونٹ.....“ اُس نے مسکرا کر کہا۔

”لو، چوم لو.....“

”بولتی آنکھیں.....“

”لو، انھیں بھی چوم لو.....“

”گالوں کے ڈمپل، کالنوں میں ڈوٹی بالیاں، صراحی دار گردن..... اور یہ۔“ اُس نے حریص بچ کی طرح چھو کر بتایا۔

”آج سب کو جی بھر کے چوم لو.....“ اُس نے گریبان کے بُن کھول دیئے۔
پھر چاہت کی بوندا باندی، بارش میں تبدیل ہونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد وہ چاند کو دیکھتے ہوئے بولی، ”آج میں پہلی
اور آخری بات محاری ہر خواہش پوری کر دوں گی..... جی بھر کے دیکھ لو، جتنا چاہو چوم لو..... اور..... اور چاہو تو.....“
پھر وہ فرش پر لیٹ گئی۔ نوجوان بھی اُس کی بغل میں لیٹ گیا۔ دونوں کا سر ایک دوسرے کی پانہوں پر تھا۔ ہوا
و بے پاؤں چل رہی تھی۔ فضائ پر سکوت تھی۔ جھینگر دم بخود، چاند ہٹا کا اور خوفزدہ سا۔ تھوڑی دیر بعد وہ فلسفیانہ لمحے میں بولی،
”ان لمحوں کو پرمیم پھل سمجھنا کہ اب میں اُس شخص کی بیوی بن جاؤں گی اور تم میرے لئے پرانے پر شہ ہو جاؤ گے.....“
وہ حسن کے سحر کا شکار ہو چکا تھا۔ اُس کی انگلیاں خوش فعلیوں میں مگن تھیں۔ اس کا جسم بے قابو ہو کر گوندھے
ہوئے آٹے کی طرح ڈھیلا اور نرم پٹنے لگا تھا۔ وقت، مٹھی سے رسیت کی طرح پھسلا جا رہا تھا۔
ٹوپیل خاموشی سے اُکتا کروہ بولی، ”جو لا اُگل کر دھرتی بھی شانت ہو جاتی ہے۔ زخم چاہے جتنا گہرا ہو، وقت کا
مرہم اُسے بھردیتا ہے۔ آج نہیں تو کلم بھی اپنا گھر بسا ہی لو گے اور ہمارا پرمیم اتنیت کا حصہ بن کر موسم کی طرح دستک دیتا رہے
گا.....“

اچانک ایک ٹھہری ٹیکار لگاتی ہوئی ہمارے اوپر سے گزر گئی تھی۔ وہ سہم کر اُس کے سینے میں سما گئی، تب وہ اُس
کے لب و رخسار پر بو سے ثبت کر کے بولا تھا، ”لیکن اب ایسا نہیں ہو گا۔ نہ میں پر پُش کھلاوں گا اور نہ تم کسی کی بیوی بن
پاؤ گی.....“ اُس کا لمحہ اُس کے عزم و ارادے کا غماز تھا۔
پھر وہ بھوکے شیر کی طرح منہ مارنے لگا تھا۔

عقلت پسندی اور مشینی عمل سے اُوب کروہ خاموشی توڑتے ہوئے بولی، ”دیکھو! چاند ہمیں ایک نک دیکھ رہا
ہے..... مجھے شرم آرہی ہے.....“

”اب ہمیں کسی کی پرواہ نہیں.....“ اُس کا لمحہ سفا ک تھا۔

سانجھ سے پہلے کشتی و گھاٹ لگانے والے لمحہ کی طرح وہ مسلسل چپو چلا رہا تھا۔

میں نے غصے میں پوچھا، ”اوتم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہے؟“

”نہیں یا! میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ لیکن.....“

”لیکن کیا؟“ میں نے فوراً پوچھا۔

”کانوں سے سب کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ کیف و سرور سے لبریز سسکیوں کو تال دیتی اُس کے بوسوں کی آواز

مجھے بھی مشتعل کرنے لگی تھی۔ اُس نے اقبالی ملزم کی طرح سچ قبول لیا۔

اُس کی طویل خاموشی سے عاجز آ کر میں نے پوچھا، ”فارغ ہو کر دونوں چلے گئے ہوں گے؟“

میرے استفسار پر وہ ماضی سے لوٹتے ہوئے بولا، ”نبیں، جب وہ کپڑے درست کر کے واپسی کے لئے اُنھے کھڑی ہوئی، تب اُس نے ہاتھ پکڑ کے اُسے بیٹھا لیا تھا۔ میں نے بھی آنکھیں کھول دی تھیں۔ مجھے لڑکی کے چہرے پر خفت و شرمساری اور نوجوان کی آنکھوں میں بگولے اُڑتے نظر آئے تھے۔“

”پھر کیا ہوا؟“ میں نے بے تابانہ پوچھا۔

وہ نوجوان کے رخسار کو دونوں ہتھیلیوں سے کپڑے کے ہونٹ اور پیشانی پر طویل بوسہ ثابت کر کے بولی، ”جب کبھی دیکھنے اور بتیں کرنے کی خواہش ہو گئی، تب ہم چودھویں کے چاند میں ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے ہوئے بتیں کریں گے۔ یہ ہمارا دوست اور ہمارے پریم اور ملن کا ساپنگھی بھی ہے۔“

”لیکن اب ایسا موقع نہیں آئے گا.....“

اُس نے جیب سے کاغذ قلم نکال کر اُسے دیتے ہوئے کہا، ”میں نے پہلے ہی دستخط کر دیا ہے۔ اب تم بھی کر

دو.....“

”یہ کیا ہے؟“ اُس نے مٹکوں نگاہوں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”ماں ڈیرا! یہ جوان بیٹ کپوزڈ سوسائیٹل نوٹ ہے۔“ اُس کا لجھہ بے حد سفاک تھا۔

اُس نے قلم کپڑا کر موبائل ٹارچ جلایا۔ سوسائیٹل نوٹ پڑھ کر وہ تذبذب میں پڑ گئی۔ اُسے پس و پیش میں گرفتار دیکھ کر اُس نے ریو الور اُس کی کنپٹی سے شاکر کہا، ”یاد نہیں؟ تم نے ہی کہا تھا، جنیں گے ساتھ، مریں گے ساتھ۔ بے وفا! شادی کی خوشی میں اپنا ہی کیا وعدہ بھول گئی؟ لیکن مجھے یاد ہے.....“

اُس نے قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا، ”یریو الور کہاں سے لائے؟“

”پریم شترو، تمہارے انسپکٹر بھائی کا ہے.....“ وہ بے فکری سے بولا۔

وہ ترپ کر بولی، ”یتم نے اچھا نہیں کیا۔ یارا یہ سروں ریو الور ہے۔“

”کیوں اُسے سزا نہیں ملنی چاہئے؟ اُسی کے کارن آج یہ نوبت آئی ہے۔“

اُس نے چیز سادھی لی تھی۔ لیکن اُس کی نگاہیں دنگائی کی طرح اُس کے چہرے پر مرکوز تھیں اور وہ چہرے پر عیاں

خوف و دہشت سے محظوظ ہو رہا تھا۔

قدرتے تو قبض کے بعد وہ بولی، ”اچھا چلو! ہمارے بعد جو ہو گا اس سے ہمیں کیا لینا دینا۔ شریر نے شریر کا بھوگ لگا ہی لیا ہے۔ کوئی چاہ کر بھی آتما کو جدا نہیں کر پائے گا۔ یار! مشکل یہ ہے کہ میں تمہیں نہ گولی مار سکتی اور نہ ترپتا ہو ادیکھ سکتی ہوں۔ تمہیں مردہ دیکھ کر اگر میں موت سے ڈرگئی، تب میں جیتیے جی مرجاوں گی۔ خود کو بھی معاف نہیں کر پاؤں گی۔ تمہاری دیوانگی نے میری آنکھیں کھوں دیں۔ یہ لوٹی، بھروسہ میری مانگ۔ میں سہاگن مرننا چاہتی ہوں۔ ریوالور سٹاکر مجھے گولی مارنا تاکہ کوئی بچانہ پائے۔ ہم مر کر امر پر کیمی کھلا میں گے۔ ریوالور کھکھل کر ٹھیک سے روشنی دکھاؤ کہ دستخط کروں۔“ اُس کا بجہ بے حد جذبائی تھا۔

اُس نے جیسے ہی ریوالور میں پر رکھا، وہ اُسے اٹھا کر اُس کی پیشانی سے سٹاکے بولی، ”پاگل پر کیمی! تم سچ مجھ مرنा چاہتے ہو؟ تو مرو۔ لیکن میں جینا چاہتی ہوں.....“
میں نے گھبرا کر پوچھا، ”اور اُس نے گولی مار دی؟“
”ہاں۔“

”اور تم نے اُسے بچانے کی کوشش نہیں کی کیونکہ تمہاری نگاہ میں یہ واردات ایک بڑی خبر تھی۔ یار! لوک تنتر کے چوتھے کھمبے میں دیمک لگ گئی ہے اور عدالیہ کو بھی انصاف کے لئے عوام سے فریاد کرنی پڑ رہی ہے۔“
”میرا منشا ہرگز نہیں تھا۔ وہ لڑکی بڑی چالاک اور شاطر تھی۔ اُس نے گفتگو میں وقت ضائع نہیں کیا۔ اُس نے فوراً سے پیشتر گولی مار دی تھی۔“

”اور تم اُسے گھر تک چھوڑ نے لگے ہو گے۔“ میرا ہجہ ترش اور طنزیہ تھا۔
”نہیں، گولی مار کرو وہ بد حواس ہو گئی تھی۔ ریوالور، سوسائٹی ٹول نوٹ اور اُس کا موبائل لے کرو وہ بھاگتی ہوئی نکل گئی، تب میں نے اُس کی نیض دیکھی تھی۔ وہ مر چکا تھا۔ اُس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ لیکن میں نے انھیں بند نہیں کیا۔“
”کیوں؟“ میرا ہجہ پر تجویز تھا۔

”کیونکہ وہ چاند پکٹکی جمائے تھیں۔ قلم اور پانی کے بوتل کو میں اٹھا لایا تھا کہ اُس پر اُس کی انگلیوں کے بھی نشانات ثابت ہو گئے ہوں گے۔“

میں نے تم سخرا نہ لجھے میں پوچھا، ”خبر میں اُس کی خود کشی کی خبر چھپی ہو گی؟“

”نہیں، نامعلوم شخص کے خلاف قتل کا ایف آئی آر درج کیا گیا تھا۔“

”قاتل کی شناخت ہوئی؟“ میں نے فوراً پوچھا۔

”پوسٹ میٹر پورٹ نے بھیڈ کھول دیا تھا۔ پلیس آج بھی قاتل حسینہ کی تلاش میں ہے۔“
 اُس نے چھپی سادھی اور میں درود یوار کو دیکھنے لگا۔ کمرے میں خاموشی کی دھنڈ دیز ہونے لگی، تب وہ اٹھ کر
 کمرے میں چھپل قدمی کرنے لگا اور میں کھڑکی کی سلاخوں کو پکڑ کے روشن و کم ضوستاروں کو دیکھنے لگا۔ تجسس کھولتے دودھ کی
 طرح بار بار ابال کھانے لگا، تب میں نے ملتحی لمحے میں پوچھا، ”یار! صرف اتنا اور بتا دو کہ تمھیں وہ لڑکی پھر کبھی نظر آئی؟“
 ”ہاں! اس واقعے کے تقریباً تین سال بعد میں نے اُسے ایک وجہیہ نوجوان کے ساتھ بڑلا نیشنل مال میں
 دیکھا تھا۔ نوجوان کی گود میں ایک پیارا سما پچہ ہمک رہا تھا اور وہ ایک خاص ادا سے ایک ہی کپ سے بچا اور نوجوان کو آئس
 کریم کھلاتے ہوئے خود بھی کھا رہی تھی۔“

وہ میرے قریب چلا آیا اور سلاخوں کو پکڑ کے آسمان دیکھنے لگا۔ مجھے لگا کہ وہ دوسرے گواہ کو تلاش کر رہا ہے۔
 اچانک وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے بولا، ”بچہ خوش ہو کرتا لیاں جاتا، کبھی ماں کی زفیں نوچتا اور کبھی نوجوان
 کے رخسار پر اچانک تھپٹر جڑ دیتا۔ وہ تھپٹر کھا کر نہال ہو جاتا۔ پھر وہ اُس کے دست و رخسار کا یوسہ لینے لگتا تھا۔“
 قدرے تو قف کے بعد اُس نے افرادہ لمحے میں کہا، ”بے چارہ! انجان کوئے کی طرح کسی اور کے بچے کو اپنا
 ہی سمجھ کر پال رہا ہے۔“

مضطرب ہو کر میں نے پوچھا، ”تم اتنے یقین سے کیسے کہہ رہے ہو؟“
 ”یار! بچہ اُس کے عاشق کا ہم شکل ہے۔ قاتل حسینہ نے شوہر کو خوبصورت تھفہ پیش کیا ہے۔“
 یہ کہہ کے وہ مُڑا اور ڈبے سے سگریٹ نکال کے ہونٹوں سے لگا کر اُسے سلا گانے لگا۔



مجھے ماں چاہئے

ڈاکٹر ریاض توحیدی

وادی پورہ، ہندوارہ، کشمیر۔ ۱۹۳۲۲۱

Email: drreyaztawheed777@yahoo.com Mob.: 7006544358

خوش ہونے کے باوجود ماسٹر جی پر بے چینی کی سی کیفیت طاری تھی۔ بورڈ کی ویب سائیٹ پر میسٹر ک کا رزلٹ اپلوڈ ہوا تھا۔ اپنے لڑکے کی ڈسٹلکشن کے بارے میں سنتے ہی اس کے اندر سے فرحت بخش احساس جاگ اٹھا۔ مہینے بھر کی تختواہ اے ٹی ایم سے یکمشت نکالنے کے ساتھ ہی پہلے مٹھائی خریدی اور بعد میں گھر کے ضروری سامان کی خریداری کر کے اپنے منتشر خیالات کے تانے بنے جوڑتے ہوئے گھر کی طرف چل پڑے۔ ذہن میں بار بار آرہا تھا کہ گھر پہنچتے ہی مناً جب اپنی ڈسٹلکشن پر فخر کرتے ہوئے اسے اپنا وعدہ یاد دلانے گا تو وہ اسے کیسے منانے میں کامیاب رہیں گے۔ گھر پہنچتے ہی وہ کچن میں چلے گئے۔ یہوی چولھا پھونک رہی تھی۔ پھونکتے پھونکتے جلتے گوبرا کا دھواں منہ کی طرف آرہا تھا جس کی وجہ سے سانس پھولنے کے ساتھ ساتھ تیق تیق میں وہ کھانس بھی رہی تھی۔ سارا کچن دھویں سے بھرا ہوا تھا اور کچن کی دیواریں اور چھت کالی ہو چکی تھیں۔ ماسٹر جی بیٹھ کر بیگ کھولتے ہوئے حسب معمول ڈاکٹروالی بات دھرانے لگے کہ کئی بار تجھ سے کہا کہ دھویں سے احتیاط برداشت کر، دمے کی بیماری میں دھواں زہر کا کام کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے کہنے پر بھی تم دھویں سے احتیاط نہیں بر تی ہو۔ خاوند کی باتیں سن کر وہ آٹے میں پانی ڈالتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں کہنے لگی کہ میں بھی کب چاہتی ہوں کہ اس دھویں سے اپنی آنکھیں انڈھی کر لوں، کتنے برسوں سے گیس چولھا خریدنے کے لئے کہتی آئی ہوں، پرم ماسٹر ہونا صرف نصیحت کرنا جانتے ہو۔

”اچھا اچھا، اب چپ بھی کرو“، ماسٹر جی نے بیگ کھولتے ہوئے کہا۔ ”یہومٹھائی کا ڈبہ، تھوڑا راش، اور تم سب کے لئے گرم کپڑے۔“

”ہاں یہ اچھا کیا کہ مٹھائی لے آئے“، یہوی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”دو پھر سے ہی ہمسایہ مبارک باد دینے کے لیے آتے رہے۔ مٹا تھوڑی بہت مٹھائی بازار سے لایا تھا وہ بھی ختم ہو گئی۔“

”تمہیں کیا لگ رہا تھا کہ میں بھول جاؤں گا۔“ ماسٹر جی نے مٹھائی کا ڈبہ کھولتے ہوئے کہا ”بیٹے کے پاس ہونے کی خبر سننے ہی میں نے مٹھائی خریدی تھی۔“

”بچ کہاں ہیں؟“ ماسٹر جی بیگ کوسائیڈ میں رکھتے ہوئے پوچھ بیٹھے۔

”گڑیا تو اپنے کمرے میں کپڑوں پر استری کر رہی ہے، بیوی آٹا گوند ہتھ ہوئے بولی۔“ مٹا اپنے کسی دوست کو مبارکباد دینے کے لئے گیا ہوا ہے۔ مگر ایک بات بتاو، اپنے لئے گرم کپڑے کیوں نہیں لائے، سردی کا موسم آنے والا ہے۔“

”میرے پاس تو اتنے کپڑے پڑے ہیں،“ ماسٹر جی مسکرا کر بولے۔ ”مجھ سے زیادہ بچوں کو گرم کپڑوں کی ضرورت ہے، میں ان میں احساسِ کمتری نہیں دیکھنا چاہتا۔“

”ہاں ہاں وہ تو ٹھیک ہے۔“ بیوی کھانستے ہوئے کہنے لگی۔ ”لیکن اپنے لئے بھی تو گرم کپڑے لاتے، ویسے بھی بچھلے ایک دو سال سے اپنے لئے کچھ نہیں لایا آپ نے۔“

”میری فکر چھوڑو،“ ماسٹر جی دوائی کا پیکٹ دیتے ہوئے بول پڑے۔ ”یہ لوپنی دوائی وقت پر لے لینا۔“ کہتے ہوئے ماسٹر جی کپڑے بدلتے کرنے کے لئے دوسرے کرنے میں چلے گئے۔ کپڑے تبدیل کرنے کے بعد وہ کوٹ سے پیسے نکال کر گئے۔ پیسے گنتے گنتے ان کی بے چینی بڑھنے لگی۔ وہ سرد آہ بھرتے ہوئے سوچنے لگے کہ ان پیسوں سے مینے بھر کا خرچ تو نکل جائے گا لیکن بچے کا شوق وہ کیسے پورا کر سکیں گے۔ یہ پیسے تو دوسری تنخواہ سے پہلے ہی ختم ہو جاتے ہیں اور پھر ادھار لینے کی مصیبت آن پڑتی ہے۔ پیسے جیب میں ڈال کر انہوں نے اخبار ہاتھ میں اٹھایا۔ اخبار کی پہلی شہ سرخی پر اس کی نظر پڑی:

”کمر توڑ مہنگائی نے غریبوں کا جینا دو بھر کر دیا ہے۔“

یہ خبر پڑتے ہی اخبار سے ان کا دل اچاٹ ہو گیا۔ اخبار کی دوسری خبروں پر سرسری نظر ڈالتے ڈالتے بچوں کی آواز سن کر وہ دوبارہ بچن میں چلے گئے۔ باپ کو دیکھتے ہی مٹا خوشی سے اچھل پڑا:

”ابو جی لائی نا میں نے میرک میں ڈسٹنشن...“

”ہاں ہاں معلوم ہے بیٹا،“ ماسٹر جی نے اس کے ماتحت کو چوتھے ہوئے کہا۔

مناًاب اپنے دوسرے دوستوں کے مارکس بتانے لگا۔ ماسٹر جی طاق پر رکھے ہوئے کپڑے اٹھا کر منے کو دیتے ہوئے

بولے ”یہ بیٹا تمہارے لئے اپنی کپڑے لایا ہوں۔“ منے نے کپڑا لیتے ہوئے پوچھا:
”مگر میری سائیکل...؟“

ماستر جی یہ سنتے ہی سوچنے لگے کہ جس بات کا ڈرخواہ ہی ہوا بھر بھی وہ مسکراتے ہوئے بولے کہ ”ہاں وہ تو ضرور
لااؤں گا۔“

”آپ تو ہر امتحان کے بعد بھی کہتے ہو،“ منا منہ بنا کر کہنے لگا۔ ”کہ لااؤں گالاؤں گا، میرے دوست تواب اپنی
کاڑیوں اور بانیکوں پر اسکول جانے لگے ہیں۔“

”پیسے کہاں بچتے ہیں بیٹا۔“ ماں چائے سامنے رکھتے ہوئے اسے سمجھانے لگی۔ ”تمہارے ابو جی کی ساری تنخواہ گھر کے
خرچے میں چل جاتی ہے۔ کچھ دنوں بعد تمہارے لئے سائیکل ضرور لائیں گے تو فلکر کیوں کرتا ہے۔“

ماستر جی سوچ ہی رہے تھے کہ اب کیا کہ لیکن یہوی کی باتوں سے انھیں تھوڑا اسکون ملا۔ سب لوگ اب
چائے پینے لگے اور منے اور اس کے ہم جماعت ساتھیوں کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ اسی دورانِ مغرب کی
اذان ہو گئی اور ماستر جی وضو بنا کر مسجد کی جانب چل دیئے۔ مولوی صاحب نے نماز پڑھانے کے بعد اعلان کیا کہ
حال ہی میں بستی کے جو گھر ان آگ کی واردات سے متاثر ہوئے ہیں، ان کے لئے چندہ جمع کرنا ہے، اس لئے تمام
لوگوں سے اپیل ہے کہ وہ مصیبت کی اس گھٹری میں متاثرین کی دل کھول کر مدد کریں۔ لوگ مولوی صاحب کے
سامنے بچھی چادر پر چندہ ڈالنے لگے۔ ماستر جی کے دل میں بھی مدد کرنے کی خواہش جاگ اٹھی لیکن دماغ مہینے بھر کے
خرچے کے بارے میں سوچنے لگے۔ لوگ چادر پر چندہ ڈالتے جا رہے تھے۔ ماستر جی نے دماغ کے بدے دل کی
خواہش پر عمل کرتے ہوئے پانچ سورو پے جیب سے نکالے اور چادر پر ڈال دئے۔ انھیں اب یہ سوچتے ہوئے تھوڑا
بہت سکون محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی ضرورت سے زیادہ مصیبت زدگان کی ضروریات اہم ہیں۔ وہ اب پر سکون ہو کے
مسجد سے باہر نکلنے لگے لیکن مولوی صاحب کی آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

”ماستر جی! آپ تھوڑی دیر کے لئے میرے ساتھ رہیں تاکہ ہم متاثرین میں یہ امداد بانت سکیں۔“
ماستر جی واپس آ کر مولوی صاحب کے سامنے بیٹھ گئے اور جمع شدہ رقم اکٹھا کرنے لگے۔ رقم اکٹھا کرنے کے بعد ماستر
جی اور مولوی صاحب نے مستحقین کے درمیان اسے تقسیم کر دیا۔

لبستی کا ہر فرد، ماستر جی کی نرم گفتاری، دیانت داری، معاملہ نہیں اور معلمانہ خوبیوں کا دل سے معرف تھا۔ ان

انسانی صفات کی بدولت ماسٹر جی کی خصیت تمام علاقے میں ایک ممتاز مقام کی حامل تھی۔ ماسٹر جی دو دہائیوں سے درس و تدریس کے پیشے سے منسلک تھے۔ انہوں نے علاقے کے پیشتر سرکاری اسکولوں میں ڈیوٹی انجام دی تھی۔ وہ بڑی لگن سے ہر جگہ علم کا نور پھیلاتے رہے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے شاگرد بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہونے کے باوجود بھی ان کی شاگردی پر نازکرتے رہتے تھے اور لوگ بھی ماسٹر جی کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ماسٹر جی نے بی ایڈ تک ہی پڑھا تھا۔ انھیں اگرچہ مزید تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا لیکن گھر کی کمزور اقتصادی حالت اور جلد ہی سرکاری نوکری ملنے کے باعث وہ یونیورسٹی جانے سے قاصر ہے۔ اس زمانے میں دیہات والے تعلیم کی طرف کم ہی دھیان دیتے تھے۔ ماسٹر جی جب ٹیچر بن گئے تھے تو انہوں نے درس و تدریس کے پیشے کو مشن کے طور پر بیول کیا تھا اور ارب سے اس مشن کی آبیاری خلوص دل سے کرتے آئے تھے۔ ماسٹر جی کی کوششوں سے بہت سارے لوگوں کی سوچ تعلیم کی طرف مائل ہوئی تھی اور چند ہی برسوں میں سارے علاقوں تعلیم کے نور سے جگمگانے لگا۔

MASSTER JI کی سروس کے اب چند ہی برس باقی تھے۔ مارنگ اسپلی میں طلباء کو اخلاقی پیکچر ختم کرنے کے ساتھ ہی چپر اسی کے ذریعے انھیں ہیڈ ماسٹر کی طرف سے آفس میں حاضر ہونے کا بلا و آایا۔ ماسٹر جی فوراً آفس کی طرف چل پڑے۔ سلام کرتے ہی آفس میں اسٹاف ممبرز کی سرگوشیاں بند ہو گئیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے بڑی خندہ پیشانی سے سلام کا جواب دیتے ہوئے مبارک باد پیش کی۔ ماسٹر جی مسکراتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئے اور ہیڈ ماسٹر صاحب سے مبارک بادی کے بارے میں پوچھ بیٹھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب بڑے فخر سے مخاطب ہوئے۔

”اس سال آپ کو سرکار کی طرف سے بیسٹ ٹیچر ایواڑ کے لئے چنا گیا ہے۔“

”سر امداد کرنا چھوڑ دینے۔ آپ یہ فرمائیں کہ مجھے صحیح کیوں یاد کیا۔“ ماسٹر جی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”نہیں، نہیں خان صاحب۔“ ایک اور استاد بیچ میں بول پڑے۔ ”ہیڈ ماسٹر صاحب بیچ کہہ رہے ہیں بلکہ انہوں نے آتے ہی ہمیں یہ خوشخبری سنائی تھی، یہ تو ہم سب کے لئے بڑے فخر کی بات ہے۔“

دوسرا اسٹاف ممبرز کی تصدیق سے اب ماسٹر جی کو اس خوشخبری پر یقین آگیا اور انہوں نے تمام اسٹاف کا شکریہ ادا کیا۔

”صرف زبانی شکریہ سے کام نہیں چلے گا۔“ ہیڈ ماسٹر صاحب مسکراتے ہوئے بول پڑے۔ ”اب تو پارٹی دینی ہی پڑے گی۔“

یہ سن کر سارا کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔

پھٹکی کے بعد ماسٹر جی بڑے خوشنگوار نمود میں گھر کی طرف چل پڑے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی انہوں نے بیوی کو آواز دی کہ کہاں ہو، جلدی آو، ایک خوشخبری سنو۔ آواز سنتے ہی بیوی کے ساتھ ساتھ نپے بھی باپ کے کمرے میں چل آئے۔

”انتنے خوش کیوں ہو۔“ بیوی دوپتہ سیدھا کرتے ہوئے پوچھ بیٹھی۔ ”کیا کوئی خزانہ ہاتھ لگ گیا ہے؟“
”خزانہ ہی سمجھو۔“ ماسٹر جی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگے۔ ”مجھے بیسٹ ٹیچر ایوارڈ ملے والا ہے۔“
”بیسٹھ تھیر۔“ بیوی کے منہ سے نکل پڑا۔ ”وہ کیا ہوتا ہے؟ مجھے تو ایسے لگ رہا تھا کہ کہیں سے پیسے آئے ہیں۔“
”اوہ ہمی۔“ بیٹی نے مسکرا کر کہا۔ ”یہ ایوارڈ پیسوں سے زیادہ عزت رکھتا ہے۔“

”ہاں ہاں۔“ ماسٹر جی کوٹ اُتارتے ہوئے کہنے لگے۔ ”پیسے بھی ملیں گے پورے پکپیں ہزار۔“
”ابو جی اب میری سائیکل ضرور آئے گی نا۔“ بیٹا خوشی سے جھومنتے ہوئے پوچھ بیٹھا۔
”اوہ ہو۔“ بیٹی ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بول پڑی۔ ”جبے دیکھو صرف اپنی ڈیماں ڈپیش کر رہا ہے، ابھی تو ماں کا شہر والے اسپتال میں علاج بھی کروانا ہے۔“

”ہاں بیٹی، ایوارڈ لینے کے بعد پہلا کام تو یہی کرنا ہے۔“ ماسٹر جی سنجیدہ ہو کر کہنے لگے۔ ”میں بھی اس معاملے سے پریشان تھا۔ ہم پراللہ کا یہ بہت بڑا کرم ہوا، لیکن علاج معالحے پر اتنے پیسے کہاں خرچ ہوں گے۔ منے کی سائیکل بھی آئے گی اور تمہارے لئے نیا جوڑا بھی۔“

”آپ لوگوں کی باتیں ختم ہو گئیں۔“ بیوی چائے سامنے رکھتے ہوئے بول پڑی۔
”بھی محترمہ۔“ ماسٹر جی مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔ ”اب چائے پینے گے۔“

چائے پینے کے بعد ماسٹر جی تیکے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے، وہ اب کمرے میں اکیلے بیٹھے تھے۔ بیوی کچن میں تھی اور پچھے اپنے کمرے میں پڑھر ہے تھے۔ وہ ماضی میں کھو گئے کہ کن کن کٹھن حالات میں انہوں نے ڈیوٹی انجام دی تھی۔ دور راز دیہات میں انھیں پیدل جانا پڑتا تھا، وہاں نہ کوئی گاڑی جاتی تھی اور نہ ہی سواری کا کوئی معقول انتظام ہوا کرتا تھا۔ خیر اللہ کے فضل سے کچھ حد تک میں اس پیشے سے شاید انصاف کر سکا۔ ویسے بھی مجھے آج ایوارڈ سے زیادہ پیسوں کی زیادہ ضرورت تھی۔ ڈاکٹر صاحب تو کئی مہینوں سے کہر رہے تھے کہ بیوی کو شہر میں امراض پچھاتی کے بڑے اسپتال

میں چند دنوں کے لئے ایڈمٹ کراؤتا کہ اس کا اچھی طرح سے چیک اپ ہو سکے، پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے میں آج کل کرتا رہا۔ اب جی پی فنڈ پر نظر تھی لیکن مکان بنانے میں وہ سب نکوالیا تھا اور تب سے ریفتڈ کر رہا ہوں۔

ٹیچرس ڈے کے دن قریب آرہے تھے، بیوی بچوں کے اصرار پر ما سٹر جی نے اپنے لئے نیا سوٹ بنوالیا۔ ایوارڈ لینے کے دن ما سٹر جی اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ شہر کے فنکشن ہال میں وقت پر پہنچ گئے۔ ہال لوگوں سے کچھ کچھ بھرا پڑا تھا۔ مقررین کے بعد وزیر تعلیم تعلیمی امورات پر روشن ڈالتے ہوئے کہنے لگے کہ ”استاد قوم کا معمدار ہوتا ہے۔“ یہ سنتے ہی ما سٹر جی کے اندر رامیوں کی ایک ہوک سی اٹھی۔ وہ سوچنے لگے۔

”ایک استاد..... قوم کا معمدار ہونے کے باوجود معاشری طور پر بیماریوں ہوتا ہے؟ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں اتنے برسوں اپنے لڑکے کے لئے ایک سائیکل بھی نہ خرید پاتا۔“ ما سٹر جی ابھی اسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے کہ ما نیک کی آواز نے انھیں اپنی طرف دوبارہ متوجہ کیا۔ مسٹر صاحب نے ایوارڈ پانے والے اساتذہ کو مبارک باد دی اور تقریب کے اختتام پر انہیں ایوارڈ سے بھی نوازا۔ ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

چند دنوں کے بعد ما سٹر جی نے اسکول سے دس دن کی رخصت لی۔ ڈاکٹر سے صلاح مشورہ کے بعد دوسرا ہی دن وہ بیوی اور منے کو ساتھ لے کر شہر کی جانب روانہ ہو گئے۔ سرکاری اسپتال کے اوپری ڈی میں چیک اپ کرنے کے بعد متعلقہ ڈاکٹروں نے انھیں ایک ہفتے تک بیوی کو اسپتال میں ایڈمٹ کرنے کی ہدایت دی، ایک ہفتے تک مریضہ کا علاج معالجہ باقاعدگی سے ہوتا رہا۔ کچھ ٹیکسٹ اسپتال میں ہی کم خرچ پر ہوئے لیکن دو تین اہم ٹیکسٹ پر انیویٹ کروانے پڑے جن پر کافی خرچ آیا۔ ڈسچارج سرٹیفکیٹ لکھتے ہوئے ڈاکٹر نے ہدایت دی کہ دھویں سے احتیاط برتنے کی ضرورت ہے اس لئے اگر روایتی چولہے کے بد لے گیس چولہے کا انتظام ہو سکے تو اس کی صحت کے لئے بہتر ہے گا۔ اسپتال سے ڈسچارج سرٹیفکیٹ لینے کے بعد ما سٹر جی بیوی کو وینگ روم میں بھاکرنے کا اپنے ساتھ لے کر مارکیٹ کی طرف چل پڑے، میڈیکل شاپ سے ضروری دوائیاں خریدنے کے بعد ما سٹر جی نے منے کو سائیکل خریدنے کی خوشخبری سنائی۔ یہ سنتے ہی منے کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا، دونوں شہر کی مشہور سائیکل بیچنے والی دکان کی طرف روانہ ہوئے۔ ما سٹر جی راہ چلتے متا سے کہنے لگے کہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہاں اتنے پیسے خرچ ہوں گے۔ اب صرف پانچ چھ ہزار ہی جیب میں موجود ہیں، ڈاکٹر صاحب نے گیس چولہے کی بھی تاکید کی ہے، خیر تھا ری سائیکل ایک دو ہزار میں آئے گی اس کے بعد گیس بھی خرید لیں گے۔ سائیکلوں کی دکان پر پہنچتے ہی منے نے ایکلس کی سائیکل

پسند کی۔ ماسٹر جی نے دکاندار سے جب اس کی قیمت پوچھی تو پانچ ہزار کا سنتے ہی ان کے ہوش اڑ گئے۔ تھوڑے وقفے کے بعد انہوں نے جب دکاندار سے دوڑھائی ہزار کی سائیکل کے بارے میں پوچھا تو دکاندار ازور زور سے ہنسنے ہوئے بول پڑا کہ جناب آج کل تو چھوٹے بیجوں کی سائیکل بھی تین چار ہزار سے کم نہیں آتی ہے۔ آپ سارے شہر میں ڈھونڈو، اس سے کم قیمت پر کہیں بھی سائیکل نہیں ملے گی۔ دکاندار کی بات سن کر ماسٹر جی پریشان ہو گئے۔ وہ سوچنے لگے کہ اگر سائیکل اتنی قیمت پر خرید لی تو گیس چولہے کے لئے پیسے کہاں سے آئیں گے، لیکن اگر سائیکل نہیں خریدی تو منے کا دل ٹوٹ جائے گا۔ خیراب سائیکل ہی خریدیں گے، گیس کے بارے میں گھر جا کر مشورہ کریں گے۔ مٹا کبھی اپنے باپ کی طرف اور کبھی دکاندار کی طرف دیکھتا رہا اور اس کے ہاتھ سے سائیکل کی ہنڈل دھیرے دھیرے پھیلنے لگی۔

”ہاں پانچ ہزار کی رسید بنادیں۔“ ماسٹر جی نے جیب سے پیسے نکالتے ہوئے کہا۔

”نہیں ابو جی۔“ مٹا سائیکل کی ہنڈل چھوڑ کر دکان سے باہر آتے ہوئے کہنے لگا۔

”مجھے یہ سائیکل پسند نہیں، کہیں اور دیکھیں گے۔“

”نہیں بیٹا۔“ ماسٹر جی اسے سمجھانے لگے۔ ”یہاں سے ہی خریدیں گے، اب کہاں سارا شہر چھان ماریں۔“

”نہیں نہیں، مجھے سائیکل نہیں لینا۔“ مٹا باپ کے بازو کو کھینچتے ہوئے وہاں سے نکل پڑا۔

مٹا خاموشی کے ساتھ ماسٹر جی کے آگے آگے چل رہا تھا کہ ماسٹر جی نے اسے روکتے ہوئے پوچھا۔

”ارے مٹا کیا ہوا.....؟ سائیکل کے لئے منع کیوں کر دیا.....؟“

مٹا نے گنجان مارکیٹ پر ایک نظر ڈالی۔ انھیں یوں محسوس ہوا کہ جیسے سارے مارکیٹ کے اوپر کالا دھوائی چھایا ہوا ہے اور ماں کے کھانسے کی آوازیں ہر طرف سے آ رہی ہیں۔ اپنی خواہش کو سینے میں ڈن کرتے ہوئے وہ آبدیدہ نگاہوں سے باپ کی طرف دیکھ کر بولا:

”لو..... مجھے سائیکل نہیں..... مجھے ماں چاہیے۔۔۔“



بے وفائی کی سوگات

شہاب الدین شفق

سنڈوارہ بھٹی سیتا مرٹھی - موبائل 8229855992

ہر روز کی طرح جب میں آج صح نیند سے بیدار ہوا تو دل کچھ بے چین سا لگ رہا تھا۔ سامنے آئینہ رکھ کر اپنے چہرے کے خدو خال کا جائزہ لیا تو پیشانی کا سوکھا پن اور چہرے کی رنگت پر پیشانی کی گواہی دے رہی تھی۔ اپنے ارد گرد کا مشاہدہ کیا، سب کچھ ٹھیک تھا۔ خوشبودار ہوا دینے والی کھڑکی کا ایک پٹ کھولا تو وہ بھی کچھ روٹھا سا معلوم پڑ رہا تھا۔ ہوا کے اندر کی انبساط و تازگی ندار تھی۔ مجھے اپنے آپ میں اپنی ذات کے اندر کچھ کی کا احساس ہو رہا تھا۔ خیال آیا کہ شاید صح کا ناشتہ نہ کرنے کی وجہ سے ان سب حالتوں سے دوچار ہو رہا ہوں۔ فوراً ناشتہ کے لئے آرڈر کیا۔ قبل اس کے میں کچھ اور سوچنا، پل بھر میں ناشتہ میرے سامنے حاضر تھا۔ میں نے طوعاً و کرہاً ناشتہ کا ڈبہ کھولا اور بغیر کسی تاخیر کے پورا ناشتہ صفا چٹ کر گیا۔ صرف اس وجہ سے کہ شاید میری شکم سیری میری گھبراہٹ و پریشانی کو ہمیشہ ہمیش کے لئے ناپید کر دئے۔ پر میری حالت کے اندر ذرہ برابر بھی تبدیل نہیں آئی۔ میں بار بار سامنے رکھے ہوئے آئینے کے اندر اپنے عکس کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید اپنی زندگی میں آج میں سب سے زیادہ آئینے کے قریب گیا تھا۔ اپنی حالت کو سدھا رنے اور اپنے ذہن کو راحت و سکون کی پڑی پر لانے کے لئے میں طرح طرح کے وسائل اور حر بے کو اپنانے میں جٹ گیا، پر تمام وسائل میرے اندر تبدیلی لانے میں ناکام ثابت ہو رہے تھے۔

ہاں پچھلے کئی مہینوں سے مایوسی اور غمگینی نے اپنی چادر میرے اوپر تان رکھی ہے۔ پر اس قدر پریشانی میں تو آج تک کبھی نہیں گھر اتھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی مصیبت کا پھاڑ مجھ پر پڑنے والا ہو یا غم و اندوہ کا بادل میرے سر کے اوپر پھٹنے کے لئے منڈل اڑ رہا ہو۔ کیا میری پریشانی کی وجہ ناہدہ تھی؟ نہیں وہ نہیں ہو سکتی ہے۔ وہ بیچاری کیوں ہو گی وہ تو دو سال سے میرا خیال رکھ رہی ہے۔ میرے اندر کے احساس کی قدر کر رہی ہے، میرے دکھ درداور بے چینی کو اپنے سر لے کر میری زندگی میں خوشیوں کی بہار لانے کے لئے نت نئے طریقے اپنارہی ہے، اپنی چاہت کا دروازہ کھول کر تیغی کا جواب اپنی بے لوث اور لازوال محبت سے دے رہی ہے۔ ہرچھوٹی بڑی خواہش کی تکمیل اور میری

پسندیدہ چیزوں کی بھرپائی کے لیے شب و روز ایک کر رہی ہے۔ پھر میری پریشانی کا سبب وہ کیوں کر رہے ہیں؟ پر میں پریشان کیوں ہوں؟ وقت کے ساتھ میری پریشانی کیوں بڑھ رہی ہے؟ میرے گھر پر کوئی حادثہ تو پیش نہیں آیا میری ماں کی طبیعت کچھ دنوں سے ناساز چل رہی تھی۔ ہونہ ہو یہ خیال آتے ہی فوراً موبائل کی طرف دوڑ پڑا اور پلک جھکتے ہی ماں کے نمبر پر کال لگایا۔ دو گھنٹی بھی اچھی طرح سے نہیں نج پائی تھی کہ ماں کال رسیسو کر بولی۔

ہیلو! شاداب! بیٹا کیا حال ہے؟

ماں کی پیار بھری آواز سن کر قدرےطمینان ہوا۔

ماں آپ کیسی ہیں؟ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ آپ کو کچھ ہوا تو نہیں؟ گھر کے لوگ کیسے ہیں؟ سب لوگ ٹھیک تو ہیں؟ ماں کی آواز سنتے ہی میں نے کئی سوالات داغ دیئے۔

ہاں بیٹا میں ٹھیک ہوں۔ گھر کے سب لوگ ٹھیک ہیں۔ کوئی پریشانی نہیں ہے۔

پھر ایک غیر منوس گھبراہٹ میرا پیچھا کیوں کر رہی ہے ماں؟

میرے حلق سے یہ سوال نکلنے ہی والا تھا پر میں اس سوال کو اپنے حلق کے نیچے دلانے میں کامیاب ہو گیا۔ اپنی ماں کو کسی بھی طرح کا ٹینشن نہیں دینا چاہتا تھا۔ قبل اس کے کہ میں فون رکھتا میری ماں سوال کر پڑھی۔

بیٹا تم ٹھیک تو ہو؟

ہاں ماں! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہے۔

پہلی مرتبہ میں نے اپنی ماں سے اتنا بڑا چھوٹ بولا تھا۔ کیا کرتا وقت نے ہی کچھ ایسے موڑ پر لاکھڑا کیا تھا کہ جھوٹ بولنا میری مجبوری اور ضرورت دنوں تھی۔ بڑھاپے کی عمر میں اپنی ذاتی پریشانی بتا کر میں اپنی ماں کو اضطراب کی چھست تلے کیسے چھوڑ دیتا۔ ماں سے بات کرنے کے بعد از سر نواپنی پریشانی کے اسباب تلاش کرنا شروع کر دئے۔ کہیں میری پریشانی کا سبب ناہدہ سے کچھ دنوں کی جدائی تو نہیں ہے؟ نہیں۔ یہ کوئی معقول سبب نہیں ہوا کیوں کہ اس سے پہلے بھی تو ہم دنوں کے بیچ کئی دفعہ گرم بحث ہوئی تھی۔ ایک دوسرے پر دوستی کی ڈوری توڑنے کا الزام لگائے تھے۔ تلخی کے دوچار کلمات ایک دوسرے کی جانب پھینک دیا کرتے تھے۔ کچھ دنوں تک بات چیت کا سلسلہ بند ہو جاتا پر ہفتہ بھی نہ گزرتا کہ ہم دنوں کسی بہانے ایک دوسرے سے معافی مانگ کر ماضی کی متنازعہ باتوں کو یوں بھول جاتے گویا

کچھ ہوا ہی نہیں۔ پر یہ وقت جدائی سے آج تک میں اتنا پریشان تو نہیں ہوا تھا۔
 ہاں! ایک بات تھی ہم دونوں کے بیچ باتوں کے سلسلے کا انقطاع اتنا مبارکبھی نہیں رہا۔ اس سے قبل ہم دونوں
 اتنے دنوں تک ایک دوسرے سے بات کئے بغیر نہیں رہتے تھے۔ میں نے ایک دن اسے کال کرنے کی کوشش بھی کی
 تھی پر اس کا فون بند تھا تو میں کیا کرتا؟ میری پریشانی کی اصل وجہ یہی تھی شاید۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ یہ کوئی وجہ ہوئی؟ دو
 متصادم افکار میرے ذہن میں گردش کرنے لگے اور میری بے قراری مزید بڑھنے لگی۔ اب مجھے ناہدہ پر غصہ آ رہا تھا۔
 میں اندر ہی اندر بڑھانے لگا۔ اتنے دن ہو گئے کم سے کم ایک بار کال تو کرنی چاہیئے تھی۔ اتنے دنوں تک بات نہیں
 کی۔۔۔۔۔ پتہ نہیں اسے اس بات کا احساس بھی ہے یا نہیں؟ اتنی غیر ذمہ دار وہ کب سے ہو گئی؟ پروہ اتنے دنوں تک مجھ سے
 بات کئے بغیر کیسے رہ سکتی ہے؟ میری برسوں کی محبت اور باتوں کو اتنی جلد کیسے بھول سکتی ہے؟ وہ میرے ان گنت احسان
 کو کیسے پل بھر میں فراموش کر سکتی ہے؟ میں اپنے آپ سے سوال کر بیٹھا کھیں اس کی سوچ بدلت تو نہیں گئی؟ اس کا دل
 بھک تو نہیں گیا؟ کسی کی نظر اسے اُچ تو نہیں لے گئی؟ ہاں وہ بلا کی خوبصورت تھی۔ ہو سکتا ہے کسی نے اسے پسند کر لیا
 ہوا اور وہ ہمیشہ ہمیش کے لئے کسی دوسرے کی امانت۔۔۔۔۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ہے۔ ناہدہ ایسا نہیں کر سکتی ہے۔ اتنی بڑی
 بے وفا کی سوغات وہ مجھ کیسے تھا پائے گی؟ مجھے اس سے بات کرنی ہو گی۔ یہ خیال آتے ہی میں موبائل کی طرف
 پکا اور فوراً ناہدہ کو کال لگائی پر ہر بار کی طرح اس سے بات کرنے میں ناکام ثابت ہوا کیونکہ لگا تاراں کا موبائل بند تبا
 رہا تھا۔ مجھ پر پانی سے باہر چھلی کی طرح بے چینی طاری تھی۔ میں اپنی حالت کو سدھارنا چاہ رہا تھا پر میری حالت میری
 بساط میں نہیں تھی۔ اسی کشمکش میں اچانک میرے موبائل کی گھنٹی بجی۔ میں موبائل کی طرف دوڑا۔ دیکھا ناہدہ کی سیہیلی
 واجدہ کا کال تھا ایک لمحہ تا خیر کئے بغیر کال رسیوکی۔ قبل اس کے کہ میں کچھ بولتا اور پوچھتا واجدہ نے ایک مقررہ تاریخ
 کو اپنی سیہیلی کی شادی کی دعوت دے کر فون کاٹ دیا۔ اس کی گفتگو سے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس نے بہت عجلت میں
 فون کیا تھا۔ مجھے اس کی بات پر بھروسہ نہیں ہو رہا تھا اور میں ایک لمبی سوچ میں غرق ہو گیا۔ کیا ناہدہ میری زندگی کو لہروں
 کے بیچ بھنور میں یوں غوط لگاتے ہوئے چھوڑ دے گی؟ اتنی بڑی بے وفا کی سوغات دے کر وہ خوش رہ پائے
 گی؟ شاید نہیں۔۔۔۔۔



خاموشیاں جو گنگنا نے لگائیں

ناہید طاہر

سعودی عرب، ریاض۔ موبائل: +966504509215

بہت ہی کم عمر میں ریحان کے دل نے کسی وجہ سے دھڑکنے سے انکار کرنا چاہا تو وہ زندگی اور موت کے دورا ہے پر کھڑا سینے میں عجیب سی گھٹن محسوس کرنے لگا۔ مایوس کن لمحات میں لگا کہ زیست اپنا دامن چھپڑانے کی کوشش میں کوشش میں کوشش ہے۔ اس نے اپنے ہوش و حواس کو بکشکل اکٹھا کر کے آہستہ سے اپنے روم میٹ کو چھوڑا۔ یہاں پر دلیں میں اس کا کوئی شناسا نہیں تھا۔ ملازمت کے سلسلے میں اپنوں سے دُور سات سمندر پار زندگی گزارنے پر مجبور، صحرائیں بسا جنی ملک، جنی شاہراہیں، جنی ماحول۔

روم میٹ نے بروقت اسپتال پہنچا دیا، ڈاکٹروں کی محنت رنگ لائی اور وہ دوبارہ راوی زیست پر گامزن نظر آنے لگا۔ اس سانحے کے بعد وہ اپنے ملک لوٹنا چاہتا تھا لیکن ڈاکٹروں کی جانب سے اُسے سفر کرنے پر سخت ممانعت تھی اور کچھ دن اسپتال میں آبز رویشن کے تحت علاحدہ کمرے میں رکھا گیا۔ یہاں شام ڈھلے ایک عجیب سی ہولنا کی چھا جاتی، درود یوار سے جھانکتی خوفناک خاموشیاں اسے ناگن کی طرح ڈسے لگاتیں۔ لمحے اس پر صدیاں بن جاتے۔ کھوئی کھوئی آنکھوں سے گھنٹوں چھپت کوتکتار ہتا۔

ہاں خاموشیوں کی چادر سر کاتی ہوئی خوبصورت نر چشم سے ہوا کا ایک معطر جھونکا بن کر روم میں داخل ہوتی۔ دوائی دیتی، ساتھ میں بی پی چیک کرنے کے بعد ایک خوبصورت مسکراہٹ کا نذرانہ پیش کرتی ہوئی انجکشن لگا دیتی۔ مسکراہٹ کے سحر میں درد کافور ہوتا اور وہ اپنے معمول کے مطابق پھر سے غائب ہو جاتی۔ اس کے آجائے سے لمبھوں کا سکوت کچھ پل کے لئے ٹوٹ ضرور جاتا، مریض بستر پر لیٹا کس قدر بے بس ہوتا ہے، تہائی زہر بن کر کس طرح وجود میں سما جاتی ہے۔ دیوار پر گلی گھڑی اپنی ٹک ٹک سے سکوت توڑنے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی جیسے ہانپئے لگتی۔ دل آرزو کرتا کہ وقت ہوا کا کوئی تیز جھونکا بن جائے اور کیلندر کے اوراق کو اپنے ہمراہ اڑا لے جائے۔ ہر آرزو کی تکمیل ممکن نہیں، وقت کے ساتھ تاریخ بھی کسی ملے کے ڈھیر میں دبی پیمار کی لاچار نظر آ رہی ہوتی۔ دراصل ریحان کی زندگی ایک تیز رفتار، مصروف ترین زندگی تھی جو پورے تواتر و تسلسل کے ساتھ ایک محور کے گرد چکر لگا رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ تہائی سے

آشنائی نہ حاصل کر سکا۔

ایک مدت کے بعد اس نے واٹ اسیپ کا جائزہ لیا، ایک انجان نمبر سے مسیح موصول ہوا تھا، یہ نیا نمبر کس کا ہو سکتا ہے؟ اسی تذبذب میں مسیح کو ملک کیا تو ایک خوبصورت شعر نظر نواز ہوا، نیچے لکھا تھا ”جلدی سے ٹھیک ہو جائیں“ ساتھ میں سرخ گلب اور خوبصورت مسکراہٹ کا ایجو جی تھا مسیح کا اختتام مہک کے نام سے ذہن میں خوشبو بکھیرتا ہوا سوالیہ نشان چھوڑ گیا!

مہک؟ لیکن کوئی شبیہہ ذہن میں ابھرنے سے قاصر رہی۔ نصف گھنٹہ بعد دوبارہ مسیح مسکرا اٹھا۔ طبیعت کے تعاقب سے استفسار تھا۔ ساتھ میں دوسرا شعر بھی مسکراہٹ بکھیرتا نظر آیا۔ گرچہ شاعری سے ریحان کو کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن اس جنبی لڑکی کے ارسال کردہ اشعار کی خوبصورتی سے وہ خود کو محفوظ رکھنے کی بجائے محفوظ ضرور ہوتا گیا۔ زندگی میں پہلی بار اسے اپنے دل کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی۔ ایک دن اچانک واٹ مسیح موصول ہوا، اس کی خوبصورت آواز، طلسماتی لب والہجہ ایسا سحر خیز تھا کہ ریحان کے دل کی دھڑکن اس قدر تیز ہونے لگی کہ گھڑی کی ٹک ٹک پرتا بض ہو گئی۔! سو شل میڈیا کی یہ دوست بہت دلچسپ ثابت ہو رہی تھی۔ اب تو یہ روز کا معمول بن گیا کہ وہ ہر دوسرے پل اس کے درد دل پر دستک دے کر بغیر اجازت قصر دل میں داخل ہو جاتی۔ ریحان بھی اس کے انتظار میں آنکھیں موندے پڑا رہتا، اس کی تہائیاں مہک کے تصور سے گنگا اٹھیں۔

زندگی کی رفتار سے اچانک کنارہ کشی حاصل ہوتا ماحول کی خاموشیاں ذہن کو تھکا دیتی ہیں۔ ایسے میں پیار سے کہا گیا ایک جملہ بھی کتنی بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے، وہ صرف مریض ہی جان سکتا ہے۔ دشیت تہائی میں مہک کی کھنک دار آواز ایک نغمگی بکھیرتی چل گئی۔ مہک کو جنون کی حد تک شاعری سے لگا چتا، اس کا ہر لفظ اپنے وجود میں ایک مکمل غزل ہوتا۔ اس کے ہر انداز میں خوبصورت اشعار کا خمار ہوتا، گویا اس کے وجود میں شاعری رچ بس گئی تھی۔ وہ دن میں کئی مرتبہ ریحان کی خیریت دریافت کرتی۔ کوئی خوبصورت ساشعر سنا کر کسی خوشبو کی مانند فضاء میں تخلیل ہو جاتی۔ ریحان پورے دو ہفتہ بعد ڈسچارج ہو کر اپنے روم پر لوٹا تو یہاں بھی صرف تہائی نے خیر مقدم کیا تھا۔ روم میٹ بڑے جذبے کے ساتھ اس کا خیال رکھ رہا تھا لیکن وہ صحیح جب ڈیوٹی چلا جاتا تو پھر سے وہی تہائی اور وہی درود یو ار کی خاموشیاں لیکن اب ریحان کی تہائیاں مہک اٹھی تھیں۔ اکثر کرے کی خاموش فضاء میں مہک کی کھنک دار آواز سے ارتعاش پیدا ہو جاتا۔ مہک بہت با تو نی لڑکی تھی دونوں نے بے شمار باتیں کیں۔ ہر موضوع پر۔ اس کی بہترین خوبی یہ تھی کہ اس کا لہجہ ہمیشہ شگفتہ ہوتا۔ کبھی کسی بات کی شکایت، شکوہ نہیں کرتی۔ بہت اوچے کردار کی مخلص لڑکی۔ با توں کا سلسلہ اتنا طویل ہو جاتا کہ وقت کا احساس ہی نہیں

رہتا۔ ایک دن ریحان نے اس سے تصویر مانگی تو پہلے تو اس نے ہنس کر ٹال دیا لیکن دوسرے دن اس نے تصویر بھی روانہ کر دی۔ چند ہی ساعت بعد وہ تصویر ڈیلیٹ کر دی گئی۔

یہ کیا، کیا؟ دکھ تلے ریحان کے لبوں پر شکوا بھرا آیا۔

بس دیکھ لیانا؟

بد نصیب آنکھوں کی تشکیل کا خیال تو رکھتیں۔

ہم!

یہ خوبصورت حرکت اکثر دہرانی جانے لگی۔ ریحان نے ایک دن شکایت کی۔

مہک تم مجھ پر بھروسہ نہیں کرتیں؟ کوئی بات نہیں، چاہوں تو تمہاری تصاویر بذریعہ سکرین شاٹ محفوظ کر سکتا ہوں لیکن میں نے ایسا نہیں کیا اور نہ ہی کروں گا۔ جب تک کہ تم مجھ پر مکمل اعتبار نہ کرو۔ کیونکہ اعتبار اور اعتماد، رشتے کی بنیاد ہوتے ہیں۔ جواب میں وہ حکلکھلا کر ہنس پڑی۔

اس وقت پہنچتی ہوئی زہرگ رہی ہو۔ ریحان نے برہمی ظاہر کی۔ جواب میں وہ خاموش رہی۔

جانا! کیا میں نے تمہارے اعتناد کو کبھی محسوس پہنچائی؟۔۔۔؟

نہیں! منقص سا جواب تھا۔

ہمگم! اب تم بھی امتحان میں کامیاب ہو کر بتاؤ تو جانوں۔ جواب میں اس کا واس میسح موصول ہوا۔

حکم کریں۔ اس کی آواز میں کسی انجانے خدشے کا ارتعاش جھلک رہا تھا۔ تم کہتی ہونا! رات کی تہائی میں میرے میسح زد وبارہ پڑھتی ہو۔ آگے ایسا نہیں کرو گی۔ بلکہ لیٹنے سے پہلے تم سارے میسح ڈیلیٹ کرو گی۔

شاید تم سے یہ نہیں ہو گا۔

کیونکہ یہ بہت مشکل کام ہے۔ ریحان مذاق اڑانے لگا تو وہ خاموش ہو گئی۔ شاید وہ آف لائے بھی ہو گئی تھی۔ ریحان کے دل پر ایک چوتھی لگی۔ کچھ دن بعد مہک نے لکھا۔ الحمد للہ! آپ پر اعتبار آ گیا۔

اس نے ایک عجیب معاملہ کیا ایک واس میسح بھیجا نیچ لکھا تھا۔ ریحان مجھے آپ کی دوستی پر اعتبار ہے۔ ایک واس میسح روانہ کر رہی ہوں، اس کو محفوظ کر لیں لیکن خدا کی قسم اس وقت یہ آپ کی سماعت کے لئے قطعی مناسب نہیں۔ ہاں! ہو سکتا ہے کبھی میرے اچانک غائب ہو جانے پر یہ میسح تمہارے کام آئے کوئی راہ تجویز کرے۔ تب یہ میسح سننا۔ اس وقت شاید یہ کچھ تسلی کا سامان مہیا کرے۔ کیا مطلب؟ ریحان وجود کی گہرائیوں سے لرزاتھا۔

یہ کیا کہہ رہی ہو، تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے؟ ہماری دوستی اس موڑ پر آپنی، جہاں بھڑرنے کا تصوّر بھی ناممکن ہے۔
مہک! تم میری زندگی میں خوبی کی طرح بس گئی ہو یقیناً فراق کا کرب، برداشت نہ کر سکوں گا۔ دل کی دھڑکن زکنے کا سبب نہ بتو۔ جب کہ ان دھڑکنوں کی حیات بھی تمہاری بخشی ہوئی ہے۔

ناا! میں کہیں نہیں جا رہی ہوں۔ ہمیشہ کی طرح وہ کھلکھلا کر نہس پڑی۔ خوش مزاجی کی بھی حد ہوتی ہے میں یہاں اس قدر مایوس غم زدہ ہوں اور تم نہس رہی ہو؟
”تجھے اٹھکھیلیاں سوچھی ہیں، ہم پیزار بیٹھے ہیں۔“

واہ واہ! آخر، میں نے آپ کو شاعر بنادیا۔ اس نے شوخی سے کھلکھلاتا ہوا اُس میتھج بھیجا۔
بس مجھے آپ پر مکمل اعتماد ہے۔ ریحان اپنی وفا کا ثبوت دیتا ہوا مہک سے وعدہ وفا کر بیٹھا۔

ریحان نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس وعدے کو نہیا بھی۔ اس کے بعد مہک نے اپنی بے شمار تصویریں روائے کیں۔ ہر تصویر تردد سے آزاد، تکلف کا گماں، اپنی شخصیت اور وجہت سے مسحور کرتی ہوئی۔ بے مثل حسن! خاص کر اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جن میں بے پناہ کشش جملہ لانی نظر آئی۔ حسن اس قدر قاتل بھی ہو سکتا ہے، ریحان کو آج پتا چلا اور وہ بے چین ہو گیا۔ کبھی دونوں کے درمیان خفگی بھی ہو جاتی۔ ایک بار ریحان نے اسے میتھج کیا کہ جاناں کچھ دونوں بعد دوبارہ مصروفیات میں الجھ جاؤں گا۔ فرست کے یہ لمحات کبھی بھول نہیں سکتا۔ اگر میں ان دونوں ریسٹ پر نہ ہوتا تو شاید تمہاری جانب توجہ بھی نہ دیتا۔ اس خوبصورت دوستی سے محروم رہ جاتا۔ جواب میں وہ شدید غصے سے غرائی۔

فرست میں ظالم پاس کا سامان بنی؟

جاناں! ظالم پاس قطعی نہیں۔ کون کہتا ہے۔ دل کی لگنی، تسلیم قلب اور جینے کا سبب ہو تم۔

دل لگنی اور کیا! وہ شعلے کی طرح بھڑک کر غصے کا اظہار کر رہی تھی۔

دل لگنی اور دل کی لگنی میں بہت فرق ہوتا ہے۔

یاا! ہر بات کا غلط مطلب نکال کر بدگمانی کا شکار ہو جاتی ہو۔ تمہیں پتہ ہے بدگمانی اللہ تعالیٰ کو بھی نہیں پسند۔ جواب میں اس کا واکس چیٹ آ جاتا۔

جس میں وہ کھلکھلا کر نہس رہی ہوتی۔

خفگی وہیں ہوتی ہے جہاں مکمل اعتماد ہو کے منالیا جائے گا۔

مجھے صحیح سے منانہ نہیں آتا۔

محبہ اڑائی جھگڑے سے بہت کوفت ہوتی ہے۔ ریحان پر یشان ہو کر جوابی واُس بھیجا۔
تب وہ کان پکڑ کر بڑی مخصوصیت سے معافی مانگتی۔
اوکے جنان! بکھی نہیں روٹھوں گی۔

ایک دن اچانک مہک کی خوبصورتی میں تخلیل ہو کر جیسے عائب ہو گئی۔ اس کی جانب سے مسیح آنا بند ہو گئے۔ پتا نہیں کیا مسئلہ پیش آگیا تھا۔ ریحان کوشش کرتا رہا کہ اس سے بات ہو سکے لیکن وہاں سے کوئی جواب نہیں ملتا اس نے کئی دنوں تک مسلسل کوشش کی لیکن نتیجہ لا حاصل رہا۔ وہ ایک پہلی بن کر رہ گئی تھی۔ ذہن کے پردے پر اس کی خوبصورت آواز میں پڑھے گئے اشعار کسی نشرت کی طرح چینے لگتے۔ جب کہ یہی اشعار کبھی باعثِ تسلیم قلب اور روح کا قرار ہوا کرتے تھے۔ اکثر وہ سک اٹھتا اور لب بھینچ کر مہک کی آواز میں گنگنائی گئی غربلیں سننے لگتا جب دردحد سے گزر جاتا اور پلکوں پر درد اشک بن کر رز نے لگتا تو وہ مہک کے واُس مسیح کا گلہ گھونٹ کر شدتِ غم سے سک اٹھتا۔ ہر پل دل کو ایک امید تھی وہ ضرور لوٹ آئے گی۔

خاموشیاں جو مہک کے تصوّر سے گنگنا اٹھی تھیں۔ اب وہی اس کی یادوں کا کفن اور ہے سک رہی تھیں۔
باتوں کا، سوالوں کا لامتناہی سلسلہ تھم گیا۔ ریحان کی ضد تھی اس نے مہک کا واُس مسیح اوپن نہ کیا۔
اسے گمان ہی نہیں بلکہ پختہ یقین تھا، جس طرح اچانک ہوا کا خوشنما جھونکا بن کر اس کی زندگی کو مہک کی تھی اسی طرح دوبارہ کہیں سے چھن چھن کرتی نہایت شاشستگی اور ملائمت سے اپنی خوبصورت آواز کا سحر جگاتی ہوئی اس کے شکستہ وجود میں روح پھونک دے گی۔

ستمبر کی نہایت سردرات اپنا قہر ڈھاتی تاریک ستاؤں سے جھاٹک رہی تھی۔ سارا عالم سو گوارگر رہا تھا۔ آسمان پر چاند بھی اپنے پورے وجود کے ساتھ رونما تھا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ یوں لگا جیسے چاند بھی ریحان کی خاموشیوں اور اُداسی پر کفِ افسوس مل رہا ہو۔

انسان کی فطرت بھی کتنی عجیب ہوتی ہے جب بہت زیادہ مسرور ہوتا ہے تب بھی شب کی تہائی میں گھنٹوں اس کو تکتارہتا اور اس سے لطف اندوں ہوتا ہے اور جب اُداس ہوتا ہے تب بھی یہی قمر انسانی وجود کے سارے درد والم اور دکھوں کی چھجن کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ بذریعہ چاندنی واپس انسان کی پلکوں پر سجا کر اشکِ قمر کے نام سے منسوب کر دیتا ہے۔
جب آنکھیں تھک گئیں تو اس نے بے بی سے سر کو خفیف انداز میں جھٹکا اور کسی حتمی فیصلے کے تحت موبائل آن کیا۔ مہک کا واُس مسیح اوپن کیا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی آنکھیں عجیب اندریشوں تلنے تھیں اور انگلیاں کلپکاری

تھیں۔ اس چاندنی میں مہک کی سحر زدہ لیکن بے انتہا اس آواز گونج اٹھی۔

جاناں! میں آپ کی زندگی میں آئی اپنی مرضی اور خوشی سے۔

آپ کو چاہا اور آپ کے دل میں محبت کی کلیاں کھلنے کا جواز بھی بنی اپنی مرضی سے۔

لیکن کبھی اچانک چلی جاؤں تو یہاں میری خوشی شامل نہیں بلکہ، رب کی مرضی ہو گی۔ تقدیر کی تحریر کو میں ناٹش لوح قلم بھختی رہی اور عمر کی سرحد عبور کرنے تک میرا بھی ایمان رہے گا۔ رب کا لکھا میری تقدیر میں بے شک میرے لئے بہتر ہی ہو گا یہ الگ بات کہ میری سمجھا سے سمجھنے سے قاصر ہے۔ ہم نے جس محبت کا محل تعمیر کیا وہ ہمیشہ صاف و شفاف تخلیٰ اور اعتماد کی بنیا پر عقل و خرد کی تعلیم کرتے ہوئے تعمیر کیا۔ اس کے پیچھے کوئی اور غایت قطعی نہیں تھی جو کہ وقتی و جذباتی سمندر کے جھاگ کے مانند بہہ جاتا۔ ہاں!!! میرا وجود ایک معہم بن سکتا ہے، اور اگر بن جائے تو غم نہ کرنا اس کے پیچھے ایک مضبوط جواز ہے۔

آپ نے مجھ سے جو وعدہ لیا کہ آپ کے سارے میسجر ڈیلیٹ کر دیا کروں۔ اور وعدہ کی اس قید سے آپ نے آزاد بھی نہیں کیا۔ جس کاملال ہر شب ایک زخم بن کر میرے وجود کو گھائل کرتا رہتا ہے۔

ریحان اس زخم کو آج آپ کے رو برو عیاں کر رہی ہوں جس کے تحت زندگی میں کبھی کسی لمحے، کسی موڑ پر بھی میری یادداشت سے غائب ہو سکتے ہو اور مری یادوں میں تھیں بھولنے کی کوئی یاد بھی باقی نہیں رہے گی خیر اس کا جواز بھی سن لیجئے۔

ایک سانحہ میرے ساتھ گزرا ہے۔ کار کے بے انتہا خطروناک حادثے کی زد میں آگئی تھی جس کی وجہ سے کئی مہینوں تک اسپتال میں زیر علاج رہی اور جب ہوش آیا تو دماغ پوری طرح ماؤف تھا، یاد ماضی سے بالکل لا تعلق پھر آہستہ آہستہ طبیعت بحال ہوتی رہی۔ یادوں سے بھی واپسی ہوتی چلی گئی رب العزت نے دوبارہ زندگی بخشی لیکن آج بھی سر میں درد اٹھتا ہے تو بڑی شدت سے، جس کا بیان لفظوں میں کرنا محال ہے۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ ایک اپریشن ضروری ہے۔

کیونکہ اس درد کا ربط دماغ کی یادداشت (میموری) کے ساتھ ہے کاش کہ آپ مجھے اپنی ضد سے آزاد کر دیتے، شاید کہ کچھ ذخیرہ محبت کا میرے موبائل، ڈائری میں موجود ہوتا جس سے دوبارہ ملنے کی کوئی صورت نکل آتی۔

ذخیرہ اکٹروں کا کہنا ہے کہ اس دوسرے آپریشن کے بعد شاید میری زندگی کا وہ سفر اور یادوں کا تسلسل حادثے کے بعد سے لے کر اس آپریشن تک میرے دماغ سے پوری طرح مت جانے کے امکانات ہیں۔

موبائل ریحان کے ہاتھوں سے چھوٹ کر فرش پر بکھر گیا۔



عقلمند

محمد علیم اسماعیل

نام و نمرہ، مہارا شتر۔ موبائل : 8275047415

سرد یوں کی ٹھٹھر تی ہوئی صحیح تھی۔ دانت سے دانت نج رہے تھے۔ اور نویدا پنے نرم گرم بستر میں سویا ہوا تھا۔ وہ سویا کہاں تھا، کب کا جاگ گیا تھا۔ پرانے آپ کو گرم رکھنے کے لیے ابھی رضائی میں ہی تھا۔ باہر سورج اپنی کرنوں کو ایک ایک کر کے زمین پر چھوڑ رہا تھا۔ اور وہ بڑھتے ہوئے پریش کو برداشت کرتا اب بھی بستر میں ہی تھا۔ کیونکہ سرد یوں میں بستر سے با تھر روم تک کاسنفر بڑا مشکل ہوتا ہے۔

اس نے سراٹھا کر پکھے کو دیکھا۔ رسی اٹھائی۔ اسٹول پر کھڑا ہو کر رسی کا ایک سراٹھے سے باندھا۔ اور دوسرا سرا اپنے گلے میں باندھ کر اسٹول کو پیر سے ڈھکلیں دیا۔ ایک جھٹکا لگا، گردن لمبی ہو گئی، زبان اور آنکھیں باہر آ گئیں۔ پھر ایک جھٹکا اور لگا اور وہ بیٹھے بیٹھے چونک پڑا۔ ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ اس نے خود کشی کا سوچا ہو۔ اس سے پہلے بھی اس طرح کے خیالات اس کے دماغ کے پردوں سے نکل رہے تھے۔ وہ اکثر اپنے کمرے میں زمین پر دیوار سے ٹیک لگائے، دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام کر بیٹھ جاتا تھا اور سوچ کے دھاروں کی گہرائیوں میں کھو جاتا تھا۔

اس کی خواہشات نے اس کا جینا چھین لیا تھا۔ چہرے پر ہمیشہ دکنے والی آسودگی جیسے کہیں کھوئی تھی۔ وہ اکثر یاد کرتا تھا اپنی طالب علمی کے زمانے کو جس میں نہ گزرے ہوئے کل کاغم ستاتا تھانہ آنے والے کل کی فکر کھائے جاتی تھی۔ اس نے زندگی میں اب تک صرف خواب دیکھے تھے اور ان خوابوں کو پورا کرنے کے لیے شارت کٹ اپنائے تھے۔ جس لڑکی سے اس نے محبت کی تھی اس کے والد نے یہ شرط رکھی تھی کہ پہلے وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے۔ اس کے بعد شادی کے متعلق سوچیں گے۔ لیکن وہ اب تک وہیں کھڑا رہے۔ جب کہ اس کی محبوہ کا لڑکا اب دوڑ رہا ہے۔ ماں باپ نے ایک گھر یلوڑکی سے یہ سوچ کر اس کی شادی کرادی کر شادی کی بعد اسے ذمہ دار یوں کا احساس ہو گا اور کم از کم وہ اپنے والد کے کاروبار میں ہاتھ بٹائے گا لیکن کوئی چھوٹا موٹا کام کرنا اسے پسند نہیں تھا۔

اس کی زندگی میں سوچل میڈیا کا عمل دخل بہت زیادہ تھا۔ وہ کوئی بھی کام کرنے سے پہلے سوچل میڈیا پر اپنے دوستوں کی رائے ضرور لیتا تھا۔ ایک روز اس نے فیس بک پر ایک پوسٹ لگائی، خود کشی کرنے کا کوئی آسان طریقہ بتاؤ؟ یا کوئی ایسا راستہ بتاؤ کہ میں ذہنی کشکاش سے آزاد ہو جاؤں اور جان بھی نجک جائے۔

بس پھر کیا تھا دھڑک دھڑک دوستوں کے کمٹس آنے شروع ہو گئے۔

کسی نے کہا، شرم سے ڈوب مرد۔

کسی نے کہا، چلو بھرپانی میں ڈوب مرد۔

کسی نے کہا، دوسرا شادی کرلو۔

تو کسی نے کہا، باہروالی کے چکر میں پڑ جاؤ۔

کسی نے کہا، بھاڑ میں چلے جاؤ۔

تو کسی نے کہا، بے حس و بے غیرت بن جاؤ۔

لیکن دوستوں کی شوخ مزاجی اس کی طبیعت میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کر سکی۔ اسے احساس نہیں تھا کہ بے موت مرننا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ از خود اپنی زندگی کو ختم کر دینا زندہ رہنے سے زیادہ مشکل ہے۔

ایک روز وہ مایوسیوں کو ساتھ لیے گھر لوٹ رہا تھا۔ چورا ہے پر کھڑے کچھ لوگوں میں سے کسی نے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ”یہ ہے پڑھا لکھا بے روزگار، آدمی عمر پڑھائی میں بر باد کی اور آدھی نوکری تلاش کرنے میں لٹا رہا ہے۔“ اور سمجھی زور زور سے ہنسنے لگے۔ وہ خاموش رہا اور وہاں سے جلد نکل گیا۔ جیسے ہی گھر میں داخل ہوا بیوی نے کہا ”کوئی کام ملایا نہیں یا آج بھی جیسے گئے تھے ویسے ہی چل پھر کے آگئے۔“ یہاں بھی وہ خاموش رہا اور تیزی سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ لوگوں کی جلی کٹی سن سن کر وہ دبے پاؤں کی بلی بن گیا تھا۔ اس کے چہرے پر نامیدی اور مایوسیوں کے بادل صاف نظر آتے تھے۔

ایک روز وہ اپنی پریشان فکروں کے ساتھ گھر میں اکیلا بیٹھا تھا۔ تب ماں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا ”لوگ کچھ اچھا لتے ہیں۔۔۔ دامن کو داغدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔۔۔ طعنے کرتے ہیں اور ہمت شکنی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم ان کے اچھائے ہوئے کچھ و غلط میں دُن ہو جائیں اور ہمت ہار کر خاک میں مل جائیں۔ ہمیں ان بیکار کی باتوں کو چیچھے چھوڑ کر آگے بڑھنا چاہیے۔“ نوید نے کہا ”کام تو مل رہا ہے ماں پر وہ

میرے لاکنہیں۔ تم کیا چاہتی ہو!! میں کوئی بھی چھوٹی موٹی نوکری کرلوں۔ پی۔ ایچ۔ ڈی تک تعلیم حاصل کرنے والا چپر اسی کی نوکری کیسے کر سکتا ہے بھلا۔“ ماں نے سمجھایا ”ہمیشہ قائم و دائم رہنے والی کامیابی کا راستہ پھلی سیڑھیوں سے ہو کر ہی اوپر کی طرف جاتا ہے۔“

دوسرے روز پھر دن بھرنو کری کی تلاش۔۔۔ دیر رات تھکا ماندا گھر آیا اور سوچا کہ تھوڑا آرام کر کے کھانا کھاؤں گا، پہ ستر پر گرتے ہی سو گیا۔ صبح نیند سے اٹھا تو ابا بولے ”صاحبزادے ایسے ہی زندگی گزار دیں گے یا کچھ کام بھی کریں گے۔“ وہ خاموش کھڑا رہا اور اپنی زندگی کو ختم کرنے کے ارادے سے گھر سے نکل پڑا۔۔۔ راستے پر چلتے چلتے سوچنے لگا۔۔۔ ”لوٹ آتا ہوں ہر روز گھر کی طرف تھکا ہارا۔۔۔ سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔۔۔ زندگی جینے کے لیے نوکری تلاش کر رہا ہوں یا نوکری تلاش کرنے کے لیے جی رہا ہوں۔۔۔ شکا بیتیں تو بہت ہے تھھ سے ائے زندگی۔۔۔ تھک گیا ہوں تجھے جیتے جیتے۔۔۔ اس سے تو موت بہتر ہے۔“ اور اس کی زبان پر خواجہ میر درد کا یہ شعر آگیا:

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

چلتے چلتے جب وہ تھک گیا تو تھوڑی دیر آرام کے لیے ایک رخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ جیب سے موبائل نکالا اور کچھ دیکھنے لگا۔ نظریں فیس بک کی ایک کہانی پڑھنے لگیں۔ کہانی کچھ اس طرح تھی۔

” راستے میں ایک بہت بڑی عمارت کا کام شروع تھا۔ مزدور سطح ہموار کرنے کے لیے ایک گھرے گڑھے میں مٹی ڈال رہے تھے۔ ایک گدھا اس گڑھے میں گر گیا اور اس کا ایک پیر ٹوٹ گیا۔ مزدوروں نے بہت کوشش کی پر گدھے کو باہر نکالنی سکے۔ وہ باہر نکلنے کے لیے چلا رہا تھا، مزدوروں کو کام جلد ختم کرنا تھا پران کا وقت بر باد ہو رہا تھا۔ انھوں نے سوچا، لٹکڑا گدھا کسی کے کیا کام کا، یہیں دفن کر کے اس کی قبر بنادیتے ہیں۔ تمام مزدور گدھے کے اوپر مٹی ڈالنے لگے۔ وہ چلاتا رہا پر مٹی ڈالنے والے ہاتھ نہیں رکے۔ پھر اچانک وہ خاموش ہو گیا۔ مزدور اس پر مٹی ڈالتے اور وہ اپنے جسم پر سے مٹی جھٹک دیتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سطح ہموار ہو گئی اور گدھا اپنے جسم سے مٹی جھٹک جھٹک کر اوپر آ گیا۔“

یہ پڑھ کر اسے اپنی ماں کی تمام باتیں یاد آنے لگیں۔۔۔ اور وہ سوچ میں پڑ گیا کہ گدھا ایک جانور ہے اور میں انسان، جانوروں میں گدھے کو سب سے زیادہ بے وقوف سمجھا جاتا ہے اور میں عقلمند۔



پہلی جنگ آزادی اور بہادر شاہ ظفر

مصنف: ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان مبصر: عبداللہ عنانی

۲۲۷۵۵۷- دیوبند / ۱۶، گدڑی وارہ، پوسٹ

Mob.: 09837680287, Email: abdullahusmani786@gmail.com

ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں انقلاب ۱۸۵۷ء ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے ہندوستان پر برطانوی اقتدار سے نہ صرف عوام عاجز آچکے تھے بلکہ مغلیہ سل بھی اپنی شان و شوکت سے محروم ہو چکی تھی، یہی وہ انقلاب تھا جس نے نہ صرف ہندوستانیوں کی قسمت کا فیصلہ کر دیا تھا بلکہ نئے ہندوستان کا بھی طلوع ہوا تھا۔

۱۸۵۷ء میں حضرت اور نگ عالمگیری موت کے بعد مغل حکومت متباہل ہو کر سمٹی چلی گئی نتیجتاً صدیوں سے ہندوستان پر نظر گڑائے برطانوی اشیرے موقع کی تلاش میں تھے۔ انہوں نے ہندوستان میں مختلف فرقوں، راجاؤں اور نوابوں کی پھوٹ کا بھر پور فائدہ اٹھایا اور انھیں آپس میں لڑوا کر اپنی بالادستی قائم کر لی تھی۔ ساتھ ہی اب ہند پر جبر و ظلم کی بھی انتہا کر دی تھی۔ کبھی ٹیکس کے نام پر تو بھی حقوق کی پامالی۔ غرض ۱۸۵۷ء میں بگال کے جوان سال نواب سرائے الدولہ کی معزولی اور جنگ پلائی کی شکست نے اہل وطن کی سیاسی اور معاشرتی حیثیت ختم کر دی تھی۔ چنانچہ اہل ہند انگریزوں کے نت نئے قوانین اور تشدد سے تنگ آچکے تھے۔ لہذا ان کے صبر و تحمل کا باندھ ٹوٹ چکا تھا۔ لہذا انہوں نے ماہ مئی ۱۸۵۷ء میں ایک ساتھ پورے ملک میں اپنی آزادی کا پرچم بلند کرنے کی کوشش کی جو کہ اپنے مقررہ وقت سے کچھ پہلے مارچ ۱۸۵۷ء میں ظاہر ہو گئی، ہبھر کیف اہل وطن کی اس چیلی جدو جہد کو انگریزوں نے غدر کا نام دیا تو ہندوستانی مورخین نے پہلی تحریک حریت کا نام دیا، اس پہلی جنگ آزادی میں جہاں ہزارہا جانیں تلف ہو گئیں تو وہیں مغل حکومت کے آخری فرد بہادر شاہ ظفر کے ساتھ اس خاندان کا خاتمہ ہو گیا، یہ موضوع طویل ہونے کے ساتھ نہیات دلچسپ بھی ہے۔ ان پونے دوسراں (۱۸۵۷ء تا حال) میں اس موضوع پر دو چار نہیں ہزارہا کتب وجود میں آئیں۔ ان میں اکثریت اردو زبان کی ہے۔ بعض برطانوی وقائع گاروں نے بھی اس موضوع پر خامہ فرمائی کی مگر ان کی مخصوص فکر برطانوی موقف کی موئیدتی ہے۔ رام نے اس موضوع پر ایک درجن سے زائد طویل مضامین قلم بند کئے جو قومی اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ نیز متعدد کتابیں مثلاً پی سی جو شی کی، انقلاب اٹھارہ سو سو تاون، سید ظہیر الدین کی ۱۸۵۷ء کے چشم دید واقعات، مرزاجیرت دہلوی کی چراغ دہلی، عبداللطیف کا تاریخی روز نامچہ ۱۸۵۷ء، خورشید مصطفیٰ رضوی کی اٹھارہ سو سو تاون، خواجه حسن نظامی

کی، غدر کی ماری بیگمات، شیخ حسام الدین کی، تصویر کا دوسرا رخ، سر سید احمد خان کی، اسباب بغاوت ہند، مولانا عبداللہ فاروقی کی، بہادر شاہ ظفر کا انسان نہ غم، وغیرہ بھی نظر سے گذری ہیں، یہ موضوع اتنا وسیع اور جامع ہے کہ کبھی کامل نہیں ہو سکتا۔ حال ہی میں ہمارے عہد کے نامور ادیب مصنف اور تاریخ نگار ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان کی ایک کتاب انقلاب ۱۸۵۷ء پر پہلی جنگِ ازادی ۱۸۵۷ء اور بہادر شاہ ظفر، منظر عام پر آئی۔ ڈاکٹر موصوف نہ صرف ہمارے دور کے اردو زبان کے متاثر قلم کار ہیں بلکہ ہندوستان کی تاریخ پر بہت گہری نظر بھی رکھتے ہیں۔ ان کی اب تک قریب تین درجمن کتابیں مختلف موضوعات پر شائع ہو کر مقبولیت پا چکی ہیں۔ ان میں عہد عالمگیری کے درباری اخبار، اردو کا جنسیاتی ادب، اور نگ زیب عالمگیر تاریخ کی روشنی میں تحریک ازادی ہند کے چند مجاہدین، سلطان علاء الدین خلجی کی دولت آباد (دیوگری) آمد، مولانا ابوالکلام آزاد اعدامی بیانات کی روشنی میں وغیرہ کتابیں قابل ذکر ہیں جو اپنی محبوبیت کا لوہا منوا چکی ہیں۔ زیرنظر کتاب پہلی جنگ ازادی ۱۸۵۷ء اور بہادر شاہ ظفر، بھی ڈاکٹر موصوف کے حسن ذوق اور وسعت مطالعہ کا آئینہ ہے۔ ڈاکٹر عبدالعزیز نے مذکورہ کتاب لکھ کر نہ صرف ہندوستان کی پہلی جنگ ازادی کی یاددازہ کر دی ہے بلکہ اردو زبان میں ایک نئی کاؤش کا بھی اضافہ کیا ہے۔ مذکورہ کتاب میں ڈاکٹر موصوف نے قریب ۲۰ عنوانات قائم کئے ہیں ان میں چند مخصوص یہ ہیں، معمر کہ ۱۸۵۷ء، ۱۸۵۷ء سے قبل کی حالت، انگریزی فونج کے ہندوستانی سپاہیوں میں بے چینی اور بغاوت، جنگ ازادی کی ابتداء، بہادر شاہ ظفر کو بادشاہ تسلیم کرنا، بادشاہ کی گرفتاری، شہزادوں کی گرفتاری اور قتل، بہادر شاہ ظفر کا مقدمہ، بادشاہ کی رنگوں آمد اور بادشاہ کی وفات، غداران وطن کی بے وفا، جنگ ازادی ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے اسباب، عوامی بغاوت، بادشاہ ظفر، بیگمات اور اولادیں، بادشاہ ظفر اور اہل خاندان تصاویر کے آئینے میں۔

مذکورہ کتاب کا طرز بیان بھی نہایت سادہ اور سہل ہے۔ ڈاکٹر موصوف نے اس کتاب کی تیاری میں نہ صرف اردو کتابوں سے استفادہ کیا ہے بلکہ متعدد انگریزی کتابوں کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ ڈاکٹر عبدالعزیز فارسی، اردو، ہندی اور انگریزی زبان پر مکمل قدرت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی اور انگریزی ماذدوں پران کی مضبوط گرفت رہی ہے۔ کتاب کے ابتداء میں نامور تاریخ نگار محترم ڈاکٹر مرتضیٰ خضر، پروفیسر ڈاکٹر رفیق زکریا کالج فار و بکن اور نگ آباد کا پیش لفظ شامل ہے جس سے کتاب کی اہمیت و افادیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

دوسوچھات پر مشتمل یہ کتاب پہلی جنگ ازادی کے بعض گمشدہ پہلوؤں کو جاگ کرتی ہے مثلاً۔ ۱۸۵۷ء سے قبل ملک کی حالت، اس عنوان کے ذیل میں رقم طراز ہیں:

”لارڈ ولزی کی پالیسی سبستی ایری سسٹم (امدادی طریقہ) کی وجہ سے کمپنی کی طاقت بڑھ گئی اور دیسی راجا کمزور اور لاپواہ ہو گئے۔ آخر میں دیسی ریاستیں انگریزی حکومت میں شامل کر لی گئیں، لارڈ ڈہوزی کا عہد ۱۸۵۶ء سے ۱۸۵۷ء تک

رہا ہے۔ اس کے عہد کے واقعات میں مسئلہ الحاق، چارڑا یکٹ الحاقات اور خطابات و پنشنوں کی ضبطی اہم شمار کیا جاتا ہے۔ ڈلہوزی نے پنجاب، برماء، ستارہ، جہانگی، ناگپور وغیرہ ریاستیں مسئلہ الحاق کی زد سے انگریزی عمل داری میں شامل کر لیں۔ اس طرح اودھ کا علاقہ بھی بدظی کی بناء پر انگریزی حکومت میں شامل کیا گیا۔ ان تینوں پالیسیوں کی وجہ سے دیسی ریاستیں انگریزی حکومت میں شامل کر لی گئیں۔

ڈاکٹر عبدالعزیز نے انگریزی کتابوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ جگہ جگہ بعض انگریزی آخزوں کے حوالے بھی کتاب کی اہمیت میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس کتاب میں ڈاکٹر موصوف نے ایک عنوان ”۱۸۵۷ء کی شعری دستاویز“ قائم کیا ہے جس کے ذیل میں ۱۸۵۷ء کے وقت جوشعری سرمایہ شائع ہوا۔ اس میں چند معروف شعراء کے فکری تاثرات شامل کئے ہیں۔ مثلاً بہادر شاہ ظفر، عظیم اللہ خان، مرزاغالب، خواجہ الطاف حسین حائی، مولانا صدر الدین آزردہ، مرزاقربان علی بیگ سالک، ظہیر دہلوی، محمد علی نقشہ، کی منظومات کی شمویت سے بھی مذکورہ کتاب کی وقت بڑھ جاتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالعزیز قابل داد ہیں کہ انھوں نے ہندوستان کی جنگ آزادی سے متعلق اردو زبان میں حسین گلدستہ سجا ہے۔ اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ زبان نہایت سہل اور عام نہیں ہے، آخری ابواب میں اب تک بہادر شاہ ظفر کی اولاد و اسلاف پر جتنی تحقیقات سامنے آئیں ہیں ڈاکٹر صاحب نے ان کو نہایت خوب صورت ترتیب کے ساتھ درج کیا ہے۔ پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء جہاں ایک طرف اپنی بدظی کاشکار ہوئی تو دوسری جانب وطن عزیز کے غداروں نے بھی ایمان فروشی سے انگریزوں کو فتح دلائی اس موضوع پر بھی ڈاکٹر عبدالعزیز نے عمدہ بحث کی ہے ایک جگہ لکھتے ہیں:

”انگریزوں کے ایک اہم مخلص اور مخبر میں رائے جیون لال بہادر کا نام سرفہrst ہے بادشاہ کے مقدمے میں بھی اہم تھے، اگرچہ مرزا اللہ بخش، مولوی رجب علی، مکندا لال، اور دیگر گواہاں تھے یہ سب انگریزی ملازم اور انگریزوں کے وفادار ہی تھے جنھوں نے بادشاہ کے خلاف گواہی دی اور انگریزوں سے انعامات حاصل کئے۔“

بہر کیف پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء اور بہادر شاہ ظفر، ایک دستاویزی کاوش ہے۔ آج کے سائنسی دور میں ہم بالخصوص نئی نسل تکنیک اور عصری علوم سے اتنا قریب ہو گئی ہے کہ اپنے اسلاف کے کارناموں سے بالکل انجام ہے۔ یہ کتاب نہ صرف اہل وطن کی جدوجہد کی مختصر داستان ہے بلکہ مغل سلطنت کے آخری تاجدار کی یاد بھی زندہ کرتی ہے۔ امید ہے قارئین کی پسند کی کسوٹی پر کھڑی اترے گی۔ صفحات: ۲۰۰، قیمت: ۲۰۰ روپے، تصریح نگار: ملنے کا پیغام: ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان، رو بر و مولانا آزاد کالج نیشنل کالونی، پلاٹ ۳۲، اورنگ آباد، مہاراشٹر۔ موبائل: 9890204715



حفظ اللسان، خالق باری اور محمود شیرانی

پروفیسر صادق

لی/۳۲، پوکیٹ ۹ رائے، جسولا، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵۔ موبائل: 9818776459

حافظ محمود شیرانی اپنی تصنیف 'پنجاب میں اردو' (مطبوعہ ۱۹۲۸ء) میں اس خیال کا اظہار کرچکے تھے کہ امیر خرسو کی طرف منسوب اور ان کے نام سے مشہور ہندوی تحقیقات قابل اعتبار نہیں ہیں اور خالق باری بھی الحاق و اغلاط سے پُر ایک ایسا ہی منظومہ ہے۔ یہ امیر خرسو کے عہد میں نہیں بلکہ ان کے بہت بعد کے دور میں لکھا گیا معلوم ہوتا ہے۔ خالق باری کے مقطع میں موجود خرسو تخلص کے بارے میں انہوں نے لکھا تھا کہ یہ امیر خرسو کے علاوہ کسی اور شخص کا بھی تخلص ہو سکتا ہے۔

'پنجاب میں اردو' کی اشاعت کے سولہ سال بعد ۱۹۳۷ء میں حافظ محمود شیرانی کی تالیف 'حفظ اللسان معروف بے خالق باری' منتظر عام پر آئی۔ اس کتاب کا سرورق ایسی معنی خیز اور قابل دادعہ بارت سے سے مزین ہے، جس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ ایک سو صفحات پر مشتمل اس کتاب کا پورا مافیہ صرف چند الفاظ میں سرورق پر ہی پیش کر دیا گیا ہے۔ سرورق کا عکس ملاحظہ ہو:

سلسلہ مطبوعات الحجمن ترقی اردو (ہند) نمبر ۲۱۳

حفظ اللسان

معروف بے

خالق باری

مصنف

ضیاء الدین خرسو در ۱۰۳۱ ارجمندی
(جو عموماً حضرت امیر خرسو دہلوی کی طرف منسوب ہے)

مرتب

پروفیسر حافظ محمود شیرانی صاحب

شائع کر دہ
انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی۔

- پہلی بار ۱۹۳۳ء، قیمت مجلد عشاریہ بلا جلد چار اعشاریہ سروق کی اس تحریر کے ذریعے یہ ذہن نشیں کرایا گیا ہے کہ ازیرنظر تصنیف کا نام 'حفظ اللسان' ہے۔ (خالق باری نہیں)
- ۲۔ یہ خالق باری نام سے معروف ہے۔ (یعنی اصل میں حفظ اللسان ہے)
- ۳۔ اس کا مصنف ضیاء الدین خسر وہ ہے۔ (امیر خسر و دہلوی نہیں)
- ۴۔ یہ ۱۰۳۱ء برجمی میں تصنیف کی گئی۔ (یعنی امیر خسر و کی وفات کے برسوں بعد لکھی گئی)
- ۵۔ یہ عام طور پر امیر خسر و دہلوی کی طرف منسوب ہے۔ (لیکن درحقیقت ان کی تصنیف نہیں ہے)
- ۶۔ اس کے مرتب پروفیسر حافظ محمود شیرانی صاحب ہیں۔
- ۷۔ یہ انجمن ترقی اردو (ہند) نے شائع کی ہے۔ (واضح رہے کہ ناشر کی حیثیت سے انجمن ترقی اردو کا نام کتاب کے معیاری اور معتبر ہونے کا ضامن ہے)
- ظاہر ہے کہ سروق کا ایک ایک لفظ خوب سوچ سمجھ کر لکھا گیا ہے۔ اب مذکورہ کتاب کی فہرستِ مضامین ملاحظہ ہو جو مندرجہ ذیل چار حصص پر مشتمل ہے۔
- (۱) عرض ضروری (مشتمل بر صفحات ۲۰) (۲) دیباچہ اول (مشتمل بر صفحات ۹۲)
- (۳) دیباچہ دوم (مشتمل بر صفحات ۱۵) (۴) متن خالق باری (مشتمل بر صفحات ۳۳)
- عرض ضروری:

سب سے پہلے عرض ضروری عنوان کے تحت حافظ محمود شیرانی نے اپنی مرتبہ کتاب کو خالق باری، کی ایک قابل اعتماد اور متفقانہ اشاعت قرار دیتے ہوئے لکھا کہ:

”اشاعت ہذا صرف بعض قدیم اور معتبر نسخوں کی قرأت پر بنیاد پاتی ہے۔ اس کامتن اکثر ویژت اندی آفس کے ایک قدیم مخطوطے نمبر ۲۵۲ رفرہ است مخطوطات ہندوستانی کا مقلد ہے لیکن اصل مخطوطے کا رسم الخط میں نے زمانہ حال کے قاری کی سہولت کے واسطے ترک کر کے راجح الوقت املاء میں بدل دیا ہے۔“

”حفظ اللسان“ معروف بـ خالق باری، کا دیباچہ اول بقول حافظ محمود شیرانی ”اس عالم گیر اعتقاد کی تردید ہے کہ خالق

باری حضرت امیر خسر و کی تصنیف ہے۔ اس دیباچہ میں رقم (محمود شیرانی) نے خالق باری کے متن پر کچھ اعتراض نیز بعض اہل قلم کے بیانات پر تقدیم کی کوشش کی ہے۔

عالم گیر اعتقاد کی تردید میں محمود شیرانی کا پہلا استدلال یہ ہے کہ دیسی زبانوں میں تعلیم کا رواج ایسے قدیم زمانے (یعنی خسر و) سے نہایت بعد معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو کہا جا سکتا ہے کہ دیسی زبانیں بہت جلد بعد ہماری تعلیم میں ہائھ بٹانے لگتیں اور ادب و لٹریچر ان میں بہت پہلے سے شروع ہو جاتا۔

حافظ محمود شیرانی کا یہ استدلال مبنی بر حقیقت نہیں ہے۔ عہد خسر و سے پہلے ہی چند دیسی زبانوں مثلاً سنسکرت، پراکرت، تمل، کنڑ، کشیری اور گجراتی وغیرہ میں چند معیاری کتابیں لکھی جا چکی تھیں۔ کیا 'امر کوش' نے اہل ہند کی تعلیم میں معاونت نہیں کی ہو گی؟

اب دیباچہ اول میں خالق باری کے متن پر کیے گئے اعتراض اور بعض اہل قلم کے روایتی بیانات پر تقدیم کی طرف آئیے۔ محمود شیرانی کے اس قول سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ روایت نے خالق باری کو حضرت امیر خسر و کی طرف منسوب کر کے ہمیں الجھن اور پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے۔ خالق باری خان آرزو کے زمانے سے لے کر ہمارے اپنے زمانے تک بالاتفاق حضرت امیر خسر و کی طرف منسوب ہے۔

محمود شیرانی نے عوامی عقیدے کے علاوہ جن بعض اہل قلم کے روایتی بیانات پر تقدیم کی کوشش کی ہے، ان کے نام با ترتیب خان آرزو، محمد حسین آزاد، محمد امین عباسی چریا کوٹی، مسعود حسن رضوی اور محمد حیدر مزراہیں۔ خالق باری کے تعلق سے ان سب کے بیانات اور محمود شیرانی کے استدلال میں اپنے دوسرے مضامین میں تفصیل کے ساتھ لکھ چکا ہوں۔ یہاں صرف اتنا عرض کروں گا کہ ان اکابرین ادب کے بیانات روایتی قرارے کر نظر انداز نہیں کئے جاسکتے۔ خالق باری کے متن کو ہدف تقدیم بناتے ہوئے محمود شیرانی نے دیباچہ اول میں اس کے نقصان پر بھی نگاہ ڈالی ہے اور واضح الفاظ میں یہ کہنے کے بعد کہ وہ امیر کی طرف اس تالیف کا انتساب امیر کی ہتھ تصور کرتے ہیں۔ لکھا ہے:

”اس کتاب میں ہر قسم کی ترتیب کا التزام مفقود ہے۔ مضمون، الفاظ اور وزن میں کوئی قرینہ ملحوظ نہیں۔ ہندی الفاظ کے تلفظ کی کوئی پرواہ نہیں کی گئی۔ بعض الفاظ کا صحیح ترجیح نہیں دیا۔ عربی، فارسی اور ہندی، مرادف بالالتزام نہیں دیے۔ کبھی فارسی ہندی دے دیئے، کبھی فارسی عربی پر اکتفا کی۔ بھرتی کے الفاظ اس کثرت سے لائے گئے ہیں کہ الفاظ برائے بیت خالق باری کا وقوع پہلو بن گئے ہیں۔“

دیباچہ اول کے اخیر میں محمود شیرانی نے خالق باری کے ان تمام قلمی اور مطبوع نسخوں کی فہرست بھی دی ہے

جو ان کے ذاتی کتب خانے میں موجود تھے۔ ان نسخوں کی مجموعی تعداد ۵۵ ہے۔ ان میں سولہ قلمی اور بقیہ ایسے مطبوعہ نسخ ہیں جو انیسویں اور بیسویں صدی میں بر صغیر کے مختلف شہروں اور مختلف مطبوعوں سے شائع ہوئے تھے۔ حافظ محمود شیرانی نے 'حفظ اللسان' معروف بـ'خلق باری' مرتب کرتے وقت ان تمام نسخوں کا مطالعہ کیا ہوا۔ ان نسخوں میں پائے جانے والے اختلافات متن کا بھی انھیں خوب اندازہ ہوگا۔ ایک بڑے اور اہم محقق ہونے کے ناطے وہ اس لکتے سے بھی بخوبی واقف ہوں گے کہ جس تصنیف کے متن میں ببرور زمانہ لاتعداد الفاظ، فقرے اور الحاقی اشعار شامل ہو گئے ہوں، اس کی تنقید سے گریز کیا جانا چاہیے۔

"محمود شیرانی نے اپنی مرتبہ کتاب کے آغاز میں 'عرض ضروری' عنوان کے تحت لکھا ہے کہ اس مرتبے کا دیباچہ دوم انجمن ترقی اردو کے ایک مخطوطے نوشتہ ۱۸۷۱ء ارجمندی کی سند پر ایک نہایت اہم اکشاف کا مظہر ہے کہ 'خلق باری' جس کا اصل نام 'حفظ اللسان' ہے۔ بابا اسحاق قنادی (حلوائی) کی فرمائش پر کسی ضیاء الدین خسرو نے (بعہد جہانگیر) تصنیف کی ہے۔ سال تصنیف ۱۸۰۳ء ارجمندی اس کے مادہ تاریخ 'تصنیف آخر' سے برآمد ہوتا ہے۔ یہ اطلاع خالق باری کے تعلق میں نہایت قیمتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ بعد کے لوگوں کو غالباً بوجہ اشتراک اسی مغالطہ پیش آیا کہ وہ ضیاء الدین خسرو کو امیر خسرودہلوی سمجھ بیٹھئے"

دیباچہ دوم کا آغاز حافظ محمود شیرانی کی اس اطلاع کے ساتھ ہوتا ہے کہ انھیں مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو ہند کے کتب خانے سے خالق باری کا ایک مخطوطہ جو ۱۸۷۱ء کا مخطوطہ سورت (گجرات) تھا، دکھایا۔ اس نسخ کی ابتداء میں ایک مختصر دیباچہ بھی ہے۔ بقول محمد شیرانی:

"اس دیباچے سے کئی امور پر روشنی پڑتی ہے، یعنی یہ کہ کتاب بچوں کو فارسی زبان سکھانے کے مقصد سے لکھی ہے۔ اس کا نام "حفظ اللسان" ہے۔ اس نام میں اشارہ ہے کہ کتاب طلبہ کو حفظ کرائی جائے۔ روزمرہ کے استعمال کے عام الفاظ اس میں جمع ہیں۔ بھریں مختلف رکھی ہیں۔ بابا اسحاق حلوائی کی فرمائش پر یہ تالیف وجود میں آئی۔ مصنف کا نام خسرو اور لقب ضیاء الدین ہے، جس سے ظاہر ہے کہ وہ مشہور تینین الدین امیر خسرو نہیں ہے بلکہ کوئی اور جس کو طوطی ہند کے ساتھ نام میں اشتراک کے سوا کوئی اور وجہ مماثلت نہیں۔"

محولہ تحریر سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ حافظ محمود شیرانی نے 'حفظ اللسان' معروف بـ'خلق باری'، انجمن ترقی اردو کے کتب خانے والے اسی مذکورہ نسخے کی بنیاد پر مرتب کی ہو گی لیکن اس مرتبہ کی تیاری میں انھوں نے مزید چند قلمی نسخوں کی امدادی ہے۔ ان سے مقابلہ بھی کیا ہے اور اصول تحقیق کے مطابق ان کی فہرست مع صراحة مقدمہ دوم

میں پیش کر دی ہے۔ مذکورہ نسخوں میں سے نسخہ الف انڈیا آفس لائبریری کا مخطوطہ نمبر ۲۵۲/ر (مطابق فہرست ہندوستانی مخطوطات از بلوم ہارٹ ۱۹۲۶ء) ہے۔ یہ مخطوطہ محمود شیرانی کے بقول ”اگرچہ بے تاریخ ہے لیکن متعدد نسخوں کے مقابلے کے بعد میں (محمود شیرانی) نے اس کو بنیادی نسخہ قرار دیا ہے جو اکثر نسخوں سے رسم الخط کے اعتبار سے قدیم ہے اور بارھویں صدی ہجری کے نصف اول کا نوشتہ معلوم ہوتا ہے۔“

اسی نسخہ الف کے بارے میں مزید معلومات دینے کے بعد محمود شیرانی نے یہ ضروری اطلاع بھی دی ہے کہ:

”اسی نسخہ کے ساتھ کسی نامعلوم مرتب کا ایک دیباچہ بھی ہے جس میں کتاب کا نام ‘مطبوع الصیان، رکھا گیا ہے۔ دیباچہ کی ضروری عبارت ہے ”ایں چند کلمہ عربی و فارسی ہر یک با ترجمہ ہندی برائے تعلیم صیان ہر طریق ریختہ منظومہ بیساختہ آمدتا خاطر ایشان رغبت نماید یاد گیر ندو لغات ہر یک دریا ہندو نام ایں کتاب مطبوع الصیان نہادہ شد و بر پنجاہ و شش فصل مرتب گردانیدہ آمد۔“

حافظ محمود شیرانی نے یہ تو بتا دیا ہے کہ انڈیا آفس لائبریری والے جس نسخے کو انھوں نے بنیادی نسخہ قرار دیا ہے وہ ’مطبوع الصیان‘ کا ہے (حفظ اللسان کا نہیں) لیکن اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ انھوں نے اس نسخے کو بنیادی نسخہ کیوں قرار دیا اور اس سے مقابلہ کرنا کیوں ضروری سمجھا۔ اگر ان کی مرتبہ کتاب کا بنیادی نسخہ حفظ اللسان، کی بجائے ’مطبوع الصیان‘ کا ہے تو پھر اصولاً اس کا نام ’مطبوع الصیان‘ معروف بے خالق باری ہونا چاہیے تھا۔ بصورت دیگر اس تبدیلی کے تعلق سے انھیں وضاحت کرنی چاہیے تھی۔

حافظ محمود شیرانی کی مشکل دراصل یہ تھی کہ انھوں نے انڈیا آفس لائبریری کے مخزونہ جس مخطوطے کو بنیادی نسخہ مان کر اپنی مرتبہ کتاب حفظ اللسان معروف بے خالق باری، میں پیش کر دیا وہ ان کے بقول بے تاریخ ہے اور اس پر مصنف کا نام بھی نہیں ہے۔ اس کے بر عکس حفظ اللسان کا وہ نسخہ جو مولوی عبدالحق نے انھیں دیا تھا اس میں نہ صرف یہ کہ ضروری اطلاع سے پُر دیباچہ بلکہ مصنف کا نام (ضیاء الدین خسرو) بھی موجود ہے جو محمود شیرانی کو اپنا موقف صحیح ثابت کرنے کے لیے مفید و معاون معلوم ہوا ہو گا۔

”حفظ اللسان معروف بے خالق باری“ کی ترتیب و تصحیح کے کام میں حافظ محمود شیرانی نے انڈیا آفس لائبریری کے ایک اور مخطوطے سے بھی مدد لی ہے، جس مخطوطے کے بارے میں تھوڑی اسی تفصیل دیباچہ دوم میں نسخہ کے ذمیل عنوان کے تحت دی گئی ہے۔ فہرست ہندوستانی مخطوطات (از بلوم ہارٹ) میں اس مخطوطے کا نمبر ۲۵۳/ر درج ہے۔ اس میں اشعار کی مجموعی تعداد ۱۳۶۲ رہے۔ یہ اکابر آباد میں لکھا گیا ہے۔ محمود شیرانی نے اس مخطوطے کے خاتمے کی

عبارت تو نقل کر دی ہے لیکن نہیں بتایا کہ صفحہ آغاز پر اس کا نام خالق باری لکھا ہے یا کوئی اور نام درج ہے۔ دیباچہ دوم کے مطابق نسخہ محمود شیرانی کا ذاتی (ملوک) مخطوطہ ہے۔ یہ نسخہ انھوں نے پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانے کی نذر کر دیا تھا۔ اس میں اشعار کی مجموعی تعداد ۱۵۵ ار ہے۔ ”بائیس شعر بعد میں کسی نے حاشیہ پر اضافے کئے ہیں ان کا قیاس ہے کہ یہ دکن میں لکھا گیا ہوگا۔ خاتمے کی عبارت یہ ہے ”تمت تمام (شد) انصاب ہندوی زبان تصنیف امیر خسرو حمدۃ اللہ علیہ تاریخ پیست و قلم جمادی الثانی ۱۳۵ هجری“۔ (حفظ اللسان معروف بہ خالق باری: دیباچہ دوم ص ۲۶)۔

کہا جاتا ہے کہ حافظ محمود شیرانی سلسلہ شناسی اور کتبہ شناسی کے علاوہ قدیم کاغذ، روشنائی، آرائش اور علم خط کی شناخت میں اپنا جواب آپ تھے لیکن حفظ اللسان اور اس کی ترتیب و تدوین میں معاون مخطوطوں کے تعلق سے ان کے کمالات کا مظاہرہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ مخطوطہ ج کی صراحت میں انھوں نے ابتدائی صفات کے بارے میں کچھ بھی نہیں لکھا۔ خاتمے کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا عنوان ”نصاب ہندوی زبان“ ہے۔

نسخہ ’د‘ کے متعلق محمود شیرانی لکھتے ہیں:

”میرا ذاتی نسخہ ہے جواب پنجاب یونیورسٹی کے کتاب خانے میں ہے۔ ناقص الطرفین مگر صحت کے لحاظ سے معتبر ہے۔ بارھویں صدی ہجری کے وسط کا نوشتہ معلوم ہوتا ہے۔“

نسخہ ’د‘ اگر ناقص الطرفین ہے تو اس کا عنوان اور مولف کا نام بھی کسی کو معلوم نہ ہوگا۔ ایسی صورت میں حفظ اللسان کی ترتیب تصحیح کے سلسلے اس کی مدد کس بنا پر لی گئی اس کی کوئی وضاحت نہیں ملتی۔ یہ مخطوطہ بارھویں صدی کے وسط کا نوشتہ معلوم ہوتا ہے۔ غالباً یہ بھی محض قیاس کی بنیاد پر لکھ دیا گیا ہے کیونکہ مذکورہ نسخہ ’د‘ توبقول شیرانی ناقص الطرفین ہے۔

نسخہ ’ه‘ کے متعلق محمود شیرانی نے لکھا ہے:

”انجم من ترقی اردو کا مذکورہ بالا نسخہ ۸۳۶:۸، تعداد اشعار ۲۲۳، فی صفحہ ۱۱۱ سطر، خاتمہ، کاتبہ نقیر سید لیثین ولد سید طاہر عرف خوب صاحب میاں، بن میاں سید لیثین مرحوم سورت بندر۔ تاریخ پیست چہارم، ماہ رب جمادی ۱۸۷“ ہجری“

دیباچہ دوم کے مطابق نسخہ ’و‘ سید نجیب اشرف (بمبئی) کا مملوک اور بقول شیرانی قابل اعتبار نسخہ ہے۔ ان کے مطابق:

منظوم خاتمے میں کتاب کا نام نصاب ظریفی بتایا گیا ہے۔ کاتب ایک پارسی ہے۔ منظوم خاتمے کے اشعار ہیں:

چو گرفت ایں نسخے طرز نوی ر تصنیف آں خرسو پہلوی
 ز اتمام عاشورہ یک ہفتہ شد کہ ایں گوہربے بہا ہفتہ شد
 امید است افضل حق کریم بخوانند و گردند طفال علیم
 تاریخ نیکو سرا نجام یافت نصاب ظریفی نکو نام یافت
 ز هفت صد فزوں سی و شش سال بود کہ طبع از خرد دستیاری نمود
 کہ صبیاں بر آیند از دام جہل شود فیض والفاظ وا شکال حل

اس خاتمہ پر اگر اعتبار کیا جائے تو ہمیں ماننا ہو گا کہ خالق باری ۳۶۷ء رہجری میں تصنیف ہوئی لیکن ان اشعار کی خامیوں پر نظر رکھتے ہوئے امیر خرسو کی طرف اس کا انتساب ناممکن ہے۔

حافظ محمود شیرانی نے محلہ اشعار کی خامیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے اس خیال کا بھی اظہار کیا ہے کہ خالق باری کا کاتب ان اشعار کا مالک ہے۔ اس کو امیر خرسو کا صحیح زمانہ معلوم نہ تھا۔ اس لیے ۷۳۷ء رہجری اس نے خالق باری کی تصنیف کا زمانہ مان لیا حالانکہ امیر خرسو اس تاریخ سے باہرہ سال قبل یعنی ۲۵۷ء رہجری میں انتقال فرمائچے تھے۔ (حفظ اللسان معروف بـ خالق باری: دیباچہ دوم ص ۲۶)

قیاس کیا جاسکتا ہے کہ امیر خرسو کی وفات کے بعد بدلتے ہوئے زمانوں کے ساتھ خالق باری کے متن میں تحریف والخالق کا جو سلسلہ شروع ہوا اور اسی کے تحت امیر خرسو کے اس منظومے کی تتبع میں جو اور منظومے وجود میں آئے نصاب ظریفی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ”نصاب ظریفی مشہور بـ خالق باری“ کا کاتب نوروز بن موبدان شاپور جی ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں۔ خرسو دہلوی کو خرسو پہلوی بنادیئے کا ذمے دار بھی یقیناً یہی کاتب رہا ہو گا (اس سے قبل بھی ایک مشہور ایرانی مصنف خرسو کو پہلوی قرار دیئے کی کوشش کرچکے ہیں) کتاب کے خاتمے کے وہ تمام اشعار جو محمود شیرانی نے سید نجیب اشرف کے مملوک نسخے نقل کیے ہیں وہ نوروز بن موبدان شاپور جی (کاتب) نے موزوں کئے ہیں، اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ ممکن ہے یہ نصاب ظریفی کے مولف کے رہبے ہوں۔ خالق باری کے اشعار ظرافت سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ خالق باری کے تتبع میں تالیف کی گئی ”نصاب ظریفی“ کے مؤلف کا تخلص ظریف یا ظریفی رہا ہو گا جس کی مناسبت سے اس منظومے کو یہ عنوان دیا گیا ہو گا۔

”حفظ اللسان معروف بـ خالق باری“ مرتب کرتے وقت حافظ محمود شیرانی کے پیش نظر مولوی عبدالحق کے

فراہم کردہ مخطوطے کے علاوہ جو مذکورہ قلمی نسخ تھے، ان میں نسخہ الف میں کتاب کا نام ”مطبوع الصیان“ لکھا ہوا ہے۔ نسخہ ج کا عنوان ”نصاب“ ہندوی زبان ہے اور نسخہ د کے منظوم خاتمے میں کتاب کا نام ”نصاب طریفی“ تحریر ہے۔ یہاں بجا طور پر یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ جب مذکورہ تینوں مخطوطے تین مختلف مؤلفین کے ہیں اور ان تینوں مخطوطوں کے عنوانات بھی باہم گریز مختلف ہیں۔ ایسی صورت میں ’حفظ اللسان‘ معروف بـ خالق باری سے ان کا موازنہ تو کیا جاسکتا ہے لیکن اس کی ترتیب و تدوین میں ان مخطوطوں سے امداد لینا اور مقابلہ کرنا کیا تحقیق کے اصولوں کے مطابق درست عمل قرار دیا جاسکتا ہے؟

یہ بات بھی وضاحت طلب ہے کہ حافظ محمود شیرانی کی مرتبہ کتاب ”حفظ اللسان موسوم بـ خالق باری“ کے متن میں یہ روایت مقطوع:

خالق باری بھتی تمام دوہوں جگ رہیا خرسو نام

کیسے شامل ہو گیا جونہ امیر خسر و دہلوی کا کہا ہوا ہو سکتا ہے اور نہ ہی جسے نام نہاد ضیاء الدین خرسو نے لکھا ہے۔ خود محمود شیرانی کے مطابق حفظ اللسان میں ضیاء الدین خرسو کا لکھا ہوا مقطوع یہ ملتا ہے:

عاقبت انجام و آخر چیزہ و یور الصرام

کردا یہ حفظ اللسان را خسر و آخر و السلام

اس بات کی بھی کوئی وضاحت نہیں ملتی کہ حافظ محمود شیرانی نے اپنی مرتبہ کتاب میں ضیاء الدین خرسو کی حفظ اللسان کے مقطع کو بے یک جبش قلم کتاب کے متن سے باہر حاشیے میں کیوں پہنچا دیا؟

مجھے یہ بات لکھتے ہوئے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ قارئین کو بھی پڑھتے ہوئے اچھا نہیں لگ گا لیکن یہ سچ ہے کہ خالق باری کی تحقیق کے معاملے میں حافظ محمود شیرانی کا قلم وہ ضبط و توازن برقرار نہیں رکھ سکا جو اس کا خاصہ رہا ہے۔



حکیم منظور کی شاعری میں کشمیر

سجاد احمد نجاح

واش باغ، پلاومہ، کشمیر۔ ۱۹۲۳۰۱۔ موبائل: 09858667464

انسان جس سماج میں پروش پاتا ہے، وہ اسی سماج میں رہ کر اپنی صلاحیتوں کو جلا بخشتا اور عمل میں لاتا ہے۔ اس طرح سے اس کا طبعی تحرک جموکلو ٹرتا اور پروان چڑھاتا ہے۔ وہ اپنی اور دوسروں کی زندگی کو اطمینان اور سست بخش بنانے کے تمام امکانات پیدا کرنے کا آرزو مند ہوتا ہے۔ اس لئے وہ سماج کے ہر اس اثر کو قبول کرتا ہے جس میں کامیابی کا راز مضمرا ہوتا ہے۔ بھی وجہ ہے کہ انسان کا اپنے سماج کے ساتھ گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ یہ بات ہر انسان جانتا ہے کہ سماج کا ہر طبقہ ایک دوسرے کے ساتھ کسی نہ کسی طور سے مسلک ہوتا ہے۔ سبھی اپنی زندگی کی ضروریات کے حصول کی بابت ایک دوسرے کا سہارا لینے کے کار بند ہوتے ہیں۔ ایسے بھی کئی اشخاص ہیں جو انفرادی یا اجتماعی شکل میں اپنے سماج پر گہری نظر رکھ کر اس کی ثبت و منفی سمت و رفتار کا تعین پیش گوئی کے طور پر کرتے ہیں۔ بلا مصلحت ارضی مخلوقات میں سب سے زیادہ سنجیدہ اور حساس مخلوق انسانی ہے۔ اللہ نے اس کے اندر جس جذبے کا امر روز از ل سے رکھا ہے اس کی نظریہ ملنا ممکن نہیں۔ یہ کرامت انسان ہی کی ہے جو اپنے خیالات، احساسات، جذبات اور مشاہدات و تجربات کو عملی بھٹی کے مشکل اور دشوار گز اراستوں سے احتیاط کے ساتھ نکال کر نئی ایجادات کو لوگوں کے تابع کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح سماج کو ثبت انداز میں آگے بڑھانے میں ادیبوں اور شاعریں کارول ہر دور کے نشیب و فراز میں اہم رہا ہے۔ وہ زمینی حقائق کے باض ہوتے ہیں۔ اُن کی نظر سماج کے تین گہری اور مشاہدہ و سیق ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کے درد و محosoں کر کے اسے اپنادرد سمجھتے ہیں۔ اس کا مد او افظوں کے سانچے میں کرتے ہیں۔ ایسے فن کاروں کو اپنے سماج کی زمین اور اس سے جڑی ہرشے عزیز ہوتی ہے۔ اس طرح کے شاعر اور دیوبنی کے قلمی سپاہی کہلاتے ہیں۔ یہ قلمی جہاد سے سماج کی تشكیل و تعمیر کے معافون ہوتے ہیں۔ ان ہی فن کاروں میں حکیم منظور کا نام وادی کشمیر کے شعراء میں ایک ماذل کے طور پر سامنے آتا ہے۔

حکیم منظور مرنجان مرنخ انسان ہو گزرے ہیں۔ وہ چونکہ مرغ اغالب اور علامہ اقبال کے فرودن سے گہر اتعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے باقی شاعروں اور دیوبنیوں کے ساتھ ساتھ ان دونوں کے کلام کا بھی غائز مطالعہ کیا ہے۔ بھی وجہ ہے کہ حکیم منظور کی شاعری میں تو ان اور زور آور حوصلوں کی کارفرمائی جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ علامہ اقبال چونکہ بنیادی طور پر حکیم منظور کے قلمی سے تعلق رکھتے تھے، اسی لئے ان کی شاعری میں اس خوب صورت اور دل فریب خط کی عکاسی نظر آتی ہے۔ یہ ارضی مناسبت حکیم منظور کو علامہ اقبال کی طرح بے حد راس آئی ہے۔ وہ اپنی شاعری میں کشمیر اور کشمیریت کے انسلاکات کا بے دریغ ظہار کرتے ہیں۔ کشمیر اور اس کا گرد و پیش حکیم منظور کی شاعری میں اسی قدر اہم ہے جس قدر حیات کے لئے

سنس ناگزیر ہے۔ حکیم منظور اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”مجھے ذاتی طور پر احساس ہے اور بجا طور پر کہ میرے لمحے اور اسلوب کے ساتھ ساتھ میرے فکر کے نتے بنے بھی اسی سرزی میں سے پیوست ہیں۔ اس لئے اچھا برا جیسا بھی ہے میرا سلوب، میرا الہجہ اور میری فُرقہ صرف میرا ہے اور کسی کا نہیں۔“ (حکیم منظور، تخفیف برفزادہ، دیباچہ، صفحہ ۲۷)

حکیم منظور نے جس ماحول میں جنم لیا ہے وہ نظرت کا عمدہ نہونہ ہے۔ یہاں کی ہر شے قدرت کی کاری گری کا لکش منظر پیش کرتی ہے۔ کشمیر کی اس خوبصورتی سے متاثر ہو کر یہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے شعراء نے بھی اپنی شاعری میں یہاں کے کسی نکسی قدرتی پہلو کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ قاری کے دل میں اس وادی کو دیکھنے کی تمنا مچل جاتی ہے۔ حکیم منظور چونکہ کشمیر ہیں اور ان کی شاعری میں کشمیر اپنے تمام تر محاسن کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ اپنے دلن کی ذرخیز اور سوندھی سوندھی مٹی پر اپنا شعری مزاج دارتے ہیں۔ انھیں یہاں کے بدلتے مسوموں کی اداویں میں نشرہ ساطاری نظر آتا ہے۔ وہ یہاں کے آبشاروں، دریاؤں جھیلوں، پہاوں اور مندی نالوں کے گیت گاتے نظر آتے ہیں۔ حکیم منظور کی شاعری میں وہ تمام تر عوامل کا فرمایا ہیں جن سے کشمیر کے حسن و جمال میں مزید رعنائیاں پیدا ہوتیں ہیں۔ اس نوع کی شاعری ان کی نظموں اور غزلوں میں خوبی پائی جاتی ہے۔ چند اشعار غامونے کے طور پر ملاحظہ ہوں۔

دعا: میرا جہلم نہ سوکھے کبھی دعا: برف کی ہے دعا برف کی
اے میرے کشمیر آنکھوں میں تیری میں سجادوں عرش سے آگے کے خواب
اہر بل کی موج کا اپنا خرام اپنی ادا سو گیا یہ بھی اگر ہمسر کہاں سے لائیے
حکیم منظور کے اس طرح کے اشعار کو پڑھنے کے بعد یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ انھیں اپنے دلن سے بے حد لگاؤ ہے۔ وہ اکثر اپنے اشعار کو شمیریت کے پُر کیف سایوں میں پیش کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ وہ شعر کہتے وقت خیال کی اتھا گہرائیوں میں ڈوبنے کے بعد وہی بات کہنے کا سلیقہ رکھتے ہیں جو یہاں کے لبادے میں اور ٹھیک ہوئی ہوتی ہے۔ تحقیق یہ کہ حکیم منظور کا شعری دامن اپنی تہذیب سے مضبوطی کے ساتھ فسلک نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر پریمی رومانی حکیم منظور کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انھیں کشمیر کے ساتھ کس قدر عقیدت اور قربت ہے۔ وہ اپنے خیالات کا اٹھا کر کھا س طرح سے کرتے ہیں:
”حکیم منظور کا موضوع خاص کشمیر ہا ہے۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں اس موضوع کو نہایت ہی سلیقے سے برداشت ہے۔ اُن کے ہاں ایسے اشعار کی نہیں جن سے اس سرزی میں کی خوشبو ٹکیت ہے۔“ (توازن، پریمی رومانی، صفحہ ۷۶)

اسی طرح مشعل سلطان پوری اپنے مضمون ”حکیم منظور۔ گجر ساقتوں کا شاعر“ میں مشق خواجہ کی موصوف کے بارے میں جو رائے قائم کرتے ہیں وہ یوں ہے:

”حکیم منظور نے اپنے گرد و پیش سے جو کچھ اخذ کیا ہے، اسے خوبصورت پیرائے میں پیش کر دیا ہے اور اس طرح جوبات بھی کہی ہے روشن عام سے ہٹ کر کی ہے۔“ (ماہنامہ شیرازہ، اشاعت خصوصی پیارا حکیم منظور، صفحہ ۱۰۲)

حکیم منظور کی شاعری کشمیری تہذیب و تمدن اور یہاں کی ثقافت کی آئینہ دار ہے۔ ان کے کلام میں یہاں کے تمام تہذیبی

عناصر کا خوب صورت میلان پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے اشعار میں ان الفاظ کو بار بار جگہ دیتے ہیں جو کشمیر کی روزمرہ زندگی میں استعمال ہوتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے موصوف اردو زبان کو خارج عقیدت کے طور پر اس طرح کے کشمیری الفاظ کا استعمال عمل میں لاتا ہو۔ یہی حکیم منظور کی شاعرانہ شان ہے۔ پھر ان کا نگزیری، ڈل، جھیل، اہر، چنار، سفیدہ، برف، اخروٹ اور سیب وغیرہ ان کی شاعری میں تازہ روح پھونٹنے کا کام کرتے ہیں۔ ایسے الفاظ کی ادائیگی سے ان کی شاعری میں کشمیر کا صور بار بار بھر کے آتا ہے یا یہ کہ ان الفاظ کے بتاؤ سے حکیم منظور خاص اس زمین سے وابستہ پکیر تراشتے ہیں۔ درج ذیل اشعار سے دیکھئے کہ حکیم کی شعری حکمت سے کیسے کشمیر کا منظر جلوہ گر ہوتا ہے۔

لوگو! ب کھولو ، کچھ بولو ، جملم ہے میلا کیوں
میں نے جب اس کو دیکھا تھا ، یہ تھا اک آئینہ سا
میرے خطوں کی خوشبوؤں کا ہوگا کچھ اندازا سا
برف گرنے کا کبھی میں یوں ہی نظارہ کروں
کافگزیری بستر میں رکھ کر کھڑکیوں کو وا کروں
حکیم منظور نے ہر ایک بات عام روشن سے ہٹ کر کہنے کی کوشش کی ہے۔ اس خوبی کے پس پردہ حکیم کی وہ فکر و سوچ ہے
جس کے سوتے کشمیری کی زمین سے پھوٹتے ہیں۔

کشمیر چونکہ حکیم منظور کے رگ و پپے میں بسا ہوا ہے۔ اس تناظر میں ان کے ہاں جور و مانوی کیفیت ان کے بعض اشعار میں نمودار ہوئے ہیں ان کی اہمیت اور بھی نگہ کر سامنے آتی ہے۔ ان کی شاعری کے آرٹ کی خوب صورتی کشمیر کے قدرتی مناظر کے فتنے بتاؤ سے نکھر کر سامنے آتا ہے۔ اپنے وطن سے بے لوٹ محبت کے اظہار میں وہ رومان کے دھاروں میں بہتے ہوئے یہاں کی مسحور گئی اشیاء سے لطف و سرور اور گہر احظہ حاصل کرتے ہیں۔ وہ یہاں کی ہر ایک چیز کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں جن سے عشق و محبت کی چمک اور سرکتے ہوئے جذبات کا لمس عیاں ہوتا ہے۔ منظور کیا خوب کہتے ہیں۔

چھپا کے خود کو کہیں رکھ نہ پائے گی خوشبو
کہ برف جب بھی گرے گی مجھ تک آئے گی خوشبو
اگر میں نام بھی لکھوں گا اس کا کاغذ پر خوشبو



ہے لاکھوں بولتے رنگوں کا درپن پھر ان پہنی ہوئی پریوں کا آنگن
اک پھول اک تقلی سخن ساز آفتاب طاری ہے مجھ پر رقص منظر ہے رقص میں
حکیم منظور کی شاعری میں پائے جانے والے رومانوی عناصر کی انفرادیت اس لئے مختلف ہیں، کیوں کہ انھوں نے رومان کی تحریک
مغض کشمیر کے حسن و جمال سے حاصل کی ہے۔ زمان راز کو منظور کی شاعری میں کشمیر کے قدرتی حسن اور یہاں کے مختلف رنگوں کے درمیں پبل کے
اظہار سے رومانی قسم کے تصورات ابھرتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر بشیر احمد خوی کو حکیم کی شاعری میں واثق اس لئے نظر آتی ہے، کیونکہ انھیں
کشمیر کے ذرے سے پیرا ہے۔ پروفیسر قدوس جاوید اپنے مضمون بعنوان ”حکیم منظور“ بحیثیت غزل کوئی اسی پبل کے متعلق رقم طراز ہیں:
”حکیم منظور کے اشعار پر اور ان کے شعری مجموعوں پر غور کیجئے، ایسا لگتا ہے جیسے یہ سبھی کسی فطرت پسند رومانی شاعر کے
کارنا نے ہیں۔ ایک اعتبار سے حکیم منظور اپنے پاؤں کے نیچے چنار و سنور سر بیز زمین اور سامنے، آس پاس دور تک پھیلے برف

پوچ کوہ و شجر کے سلسلوں کے حوالے سے فطرت پسند تو ہیں اور اسی تعلق سے ان کے یہاں رومانیت کے محترم عناصر کی بھی کمی نہیں۔ لیکن عام فطرت پسند اور رومانوی شاعروں کے برعکس۔ ”ماہ نامہ شیرازہ، اشاعت خصوصی بیان حکیم منظور، صفحہ ۲۸، ۲۷، ۲۵“

ناتمام (۱۹۷۷ء)، ملمس چار (۱۹۸۲ء)، برف رتوں کی آگ (۱۹۹۰ء)، خوشبو کا نام نیا (۱۹۹۱ء)، پھول شفقت آگمن کے (نظموں کا مجموعہ ۱۹۹۳ء)، شعر آسمان (۱۹۹۷ء) صبح شفقت تلاوت (۱۹۸۸ء)، برف آفتبا (نظموں کا مجموعہ ۲۰۰۰ء)، بخن برف زاد (۲۰۰۳ء)، قلم زبان شگاف (۲۰۰۵ء) حکیم منظور کے وہ شعری مجموعے ہیں جن میں کشمیر اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ جلوہ نما ہوتا ہے۔ جہاں ان شعری مجموعوں میں حکیم منظور نے اس زمین سے وابستہ ڈکشن عناصر کا اپنے مخصوص اسلوب میں اظہار کیا ہے وہی انھوں نے یہاں کے اُس ماحول کو بھی پیش کیا ہے جو اپنے سینے میں ایک طویل عرصے سے درد کرب کو برداشت کر رہا ہے۔ اگر حکیم منظور کی شاعری کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت بر جستہ سامنے آتی ہے کہ ان کے ہر مجموعہ کلام میں اس ظلم و ستم کی سکیاں سنائی دیتی ہیں جو یہاں کے مکین ایک زمانے سے جھیل رہے ہیں۔ حکیم منظور نے یہاں کے پُرآشوب حالات کا سنجیدگی کے ساتھ مشاہدہ کر کے ایسے نوحہ کہے ہیں جن سے پھر دل انسان بھی نرم پڑتا ہے۔ حکیم منظور اس نوع کے اشعار سے کیا کہنا چاہتے ہیں آپ کو اس بات کا درج ذیل اشعار سے خوبی اندازہ ہوگا۔

اتنی سرکش ہو گئی اب ہوا اطراف میں جیب میں رکھی ہوئی ہر شخص کی دستار ہے
خون تشنہ شام رویہ نغم آفتبا
پاؤں سے سر تک آنکھ کا منظر ادا ہے
چنار چہرے ہیں ان کی کوئی زبان نہیں ہے
سلگ رہے ہیں پر کہیں دھواں نہیں ہے
اب کے میرا کعبہ دل دشمنوں کی زد میں ہے
پھر مد د کرنا ا بابیوں کے لشکر بھیجا
کچھ کہا جاتا نہیں ہے کون کب کس صف میں ہو
مذکورہ بالا اشعار سے کشمیر کے دکھ درد اور بے بُی کا احساس ہوتا ہے۔ اب تک حکیم منظور کے کلام پر جتنا کچھ لکھا جا چکا ہے
ان تمام تحریریں سب کے یہاں یہ بات مساوی طور پر سامنے آتی ہے کہ ان کی شاعری میں کشمیر کے درد کرب کی عکاسی حیرت انگیز
طور پر کی گئی ہے۔ ڈاکٹر پریم رومانی حکیم منظور کی شاعری میں اس پہلو کے پیش نظر لکھتے ہیں:

”حکیم منظور نے اپنی غزلوں میں اس دور کا آشوب پیش کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ منظور کی شاعری میں عصر حاضر کے انسان درد کرب کھل کر سامنے آیا ہے۔“ (توازن، ڈاکٹر پریم رومانی، صفحہ نمبر ۲۶)

مجموعی طور پر حکیم منظور کی شاعری کے ڈسکورس میں کشمیر کا جو تصور جھلکتا ہے وہ ہر لحاظ سے حکیم کے فکر و فن اور ان کے منفرد ڈکشن کا پتادیتا ہے۔ حکیم منظور کے کلام میں کشمیر کی عکاسی کے سلسلے میں کشمیری زبان کے مر وجہ الفاظ کے استعمال سے محسوس ہوتا ہے کہ گویا ان کی شاعری کا قبلہ ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است کا مصدق پیش کرتا ہو۔ واقعی حکیم منظور کی شاعری میں کشمیر کا دل دھڑکتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

اے میرے کشمیر آنکھوں میں تیری
میں سجاوں عرش سے آگے کے خواب



غزلیں

لطیف شاہد

برہان پور، مدھیہ پردیش۔

موباکیل: 8871699926

علیم صبانویدی

رَأْسِ مَهْنَدِي اسٹریٹ، چکنی

موباکیل: 9840361399

یہ جھوٹ ہے کہ وقت موافق نہیں رہا
 اپنے ہی پاس جذبہ صادق نہیں رہا
 اے جذب شوق کوئی ٹھکانہ تلاش کر
 یہ شہر اب ہمارے مطابق نہیں رہا
 ہر گام پر رہا تری قدرؤں کا پاسدار
 اے زندگی میں تیرا منافق نہیں رہا
 میں ہی اکیلا مورد الزام تو نہیں
 تو بھی تو قول و فعل میں صادق نہیں رہا
 سُونی ہے مذتوں سے محبت کی رہگزرا
 عذر تو ہے مگر کوئی وامق نہیں رہا
 سورج مکھی کی طرح بدلتا رہا ڈگر
 پھر بھی امیر شہر منافق نہیں رہا



تلسلی بخش تہائی سے ملنا
 بھرے ماقم میں شہنائی سے ملنا

تمھارے سر ہے سہرا سبز رُت کا
 مرے حق میں ہے پُروائی سے ملنا

اجالوں کو گوارا ہی نہیں تھا
 مرے کمرے کا انگنانی سے ملنا

سمندر میں اُتر کر کب ہے آسان
 بھنور کو اوڑھے گھرائی سے ملنا

نہ آیا راس ہے بستر کو مرے
 کنوارے پن کی انگڑائی سے ملنا



غزلیں

ڈاکٹر فیاض احمد علیگ

اسٹینٹ پروفیسر، ابن سینا طبیعت کالج

بینا پارہ، عظم گڑھ۔ 9415940108

ظفر اقبال

فتح پور، اتر پردیش

موباہی: 9236692111

ہم کو آنکھوں سے جب وہ پلانے لگے
 شیخ جی بے سب تملانے لگے
 کوئی جا کر مرے کوزہ گر سے کہے
 میری مٹی بھی اب تو ٹھکانے لگے
 روٹھ کر بے سب کشمکش میں ہے وہ
 میرے سینے سے اب کس بہانے لگے
 نور حق کا جو پھیلا تو پھر یہ ہوا
 لوگ اپنے دئے خود بچانے لگے
 لاج ساتی کی رکھنی تھی ہم کو یہاں
 اس لئے بن پئے لڑکھرانے لگے
 غور سے میں نے دیکھا جو اس کی طرف
 اس کے چہرے پہ رنگ آنے جانے لگے
 خود شناشی ہے فیاض مشکل بہت
 خود سے ملنے میں مجھ کو زمانے لگے



کنارے ٹوٹ گئے کشتیاں بچانے میں
 بھنور کی زد میں رہے بادباں بچانے میں
 بلندی راس نہ آئی کسی طرح اس کو
 زمیں پہ آیا ہے وہ آسمان بچانے میں
 بھٹک رہا ہے ابھی تک اندر ہیری را ہوں میں
 یقین سے دُور ہوا ہے گماں بچانے میں
 ملا نہ سایہ زمانے میں عمر بھر اُس کو
 مکاں سے دُور ہوا سائیاں بچانے میں
 ہو تھا را ہی اس میں نہیں ہمارا بھی ہے
 بہا ہے خون جو ہندوستان بچانے میں
 کل سکا نہ ظفر دشمنوں کے زرغے سے
 ہزاروں زخم لگے جسم و جاں بچانے میں



غزلیں

طاہر نقاش

حریر پورہ، براہانپور، مدھیہ پردیش

موباکیل: 7000494183

منظرمی خیامی

باغِ ماذلام رائے گڑھ، کون۔

موباکیل: 7887793191

آپ اپنے ہی کو ایسے کیا رُسوا میں نے
جس کو سجدہ نہیں کرنا تھا کیا تھا میں نے
وقت نے چن لئے سب پھول تری یادوں کے
اک ترے گاؤں کا رستہ نہیں بھولا میں نے
رقص آمادہ تھے مجذوب محبت سارے
خود کو کس طرح سے روکے ہوئے رکھا میں نے
مجھ کو ماں باپ کی شفقت کی بہت یاد آئی
راہ میں دیکھ لیا جب کبھی سایہ میں نے
کون ہے عہد فراموش محبت ، تو ہے
کس نے الزامِ وفا سر پ اٹھایا ، میں نے
میں نہ تھا میں نہ رہوں گا نہ ابھی کچھ ہوں میں
خود کو سمجھا ہے تو بس اتنا ہی سمجھا میں نے
دل کو نقصان کا دھڑکا ہی لگا رہتا ہے
خواہ مخواہ کر لیا یہ عشق کا سودا میں نے
تو مرے خاتہ دل میں ہے نہاں تو پھر کیوں
ہر طرف تھجھ کو تلاشا تجھے ڈھونڈا میں نے



ایسا تو پاک صاف کوئی دوسرا نہیں
سایا ترے بدن کا کسی نے چھووا نہیں
ہم نے حقائق سے تعلق رکھا سدا
دیکھے سنہرے خواب بھروسہ کیا نہیں
وہ شخص آفتاب نچوڑے گا کس طرح
انگارہ جس نے ہاتھ میں اب تک لیا نہیں
جلتے ہوئے چراغ وہ تھے میں دے گیا
تا حال جس کے گھر سے اندر ہرا گیا نہیں
شہرت مرے قریب بھلا کیسے آئے گی
روٹی کو چاند میں نے ابھی تک لکھا نہیں
منظرنے چوم چوم کے پلکوں پر رکھ لیا
اب راستے میں کوئی ترانش پا نہیں



غزلیں

حبیب ندیم

مسقط عمان

موباکل: +96895476137

دل کا یہ تقاضا ہے جیا جائے کہیں اور
اب خود کے لئے کچھ تو کیا جائے کہیں اور
دستورِ محبت سے یہ محفل نہیں واقف
اب عشق کا افسانہ پڑھا جائے کہیں اور

 جب حد سے گزر جاتا ہے الفت میں دوانہ
کہتا ہے جنوں آ بھی چلا جائے کہیں اور
ہم نے تو گرا ڈالی ہے دیوارِ فراقت
اب حرفِ جدائی کو لکھا جائے کہیں اور

 یہ مرحلہِ عشق کا اک موڑ عجب ہے
کہنا ہے یہاں اور کہا جائے کہیں اور
بخشنا ہے حبیب اس نے عجبِ جامِ محبت
محفل سے الگ ہو کے پیا جائے کہیں اور



ریاض منصف

مبین

موباکل: 9867176448

بہت سے چہرے ایسے ہیں جو پچانے نہیں جاتے
وہاں جاتے نہیں ہیں ہم جہاں جانے نہیں جاتے
ہمارے سب مسائل حل اسی کی ذات کرتی ہے
کہیں اب زلف کیتی ہم بھی سلبخانے نہیں جاتے
کبھی اک وقت تھا ان کی گلی میں ہی ٹھکانہ تھا
وہاں اب وہ نہیں تو دل کو بہلانے نہیں جاتے
ہر اک کو کیوں سنائیں اپنے دل کی داستانیں ہم
زمانے بھر کو اپنے داغ دکھلانے نہیں جاتے
ہمیں نے عشق کے سب عہدو پیام توڑ ڈالے ہیں
وفا کیا ہے یہ دنیا بھر کو سمجھانے نہیں جاتے
اگرچہ رونقیں بڑھتی چلی جاتی ہیں شہروں کی
جودل میں جاگزیں ہیں کیوں وہ ویرانے نہیں جاتے
ہماری بے خودی سے ان کو منصف خوف آتا ہے
اب ان کی مخلوقوں میں ہم سے دیوانے نہیں جاتے



غزلیں

ڈاکٹر ممتاز منور

پونہ، مہاراشٹر۔ موبائل: 9881469520

نادرہ ناز

ہر سی اسٹریٹ، کوکاتا۔

موبائل: 9331817280

اب بھی رہتا ہے مرے دل میں اُجالوں کی طرح

وہ بھلا لیا تھا جسے گزرے خیالوں کی طرح

جب بھی چلنے کا ارادہ کیجئے

وقت کی رفتار سمجھا کیجئے

ڈھونڈتے رہ گئے ہم دے نہ سکے کوئی جواب

پیار بھی اس نے کیا ہم سے سوالوں کی طرح

آپ کی تھائیاں بھی رو پڑیں

اس طرح چپ کے نہ رویا کیجئے

یوں جدائی کا ترے وقت کٹا تیری قسم

ایک اک پل ہے کہ گزرا ہے وہ سالوں کی طرح

راہ چلنے کارواں کے ساتھ ساتھ

راہ میں خود کو نہ تھا کیجئے

آج بھی جاؤ کہ ستارے بھی چلے سمیت اُن

دل میں ارمان مچلتے ہیں غزالوں کی طرح

جب نہیں ہے آپ کو تاب سخن

تو نگاہوں سے ہی شکوہ کیجئے

آج بھی یاد کیا کرتے ہیں دیتے ہیں مثال

داستانِ عشق کی اپنی ہے حوالوں کی طرح

آپ کو رُسوا کرے کوئی اگر



ناز اس کو بھی نہ رُسوا کیجئے



گجراتی نظمیں

مصنف: جینت پرمار ترجمہ: عادل منصوری

باغ میں	باغ میں	گھر چھوڑتے ہوئے
د بے پاؤں	صح سویرے	سر جھکا کے دیواریں
کھڑکی سے گھر میں گھسی	آنکھیں موند کے چلتے ہوئے	چاروں اور کھڑکی تھیں
میز پر	ہوا کی ٹھوکر لگتے ہی	دروازے بانہیں پھیلا کر
گلدان میں	گھری نیند میں	پیار سے بلا تے
سارے مر جھائے ہوئے	کوئی سنتی خواب میں	اور کھلی کھڑکیاں
پھولوں کو دیکھ	کھوئی ہوئی نازک کلی کی	پُرمید نظروں سے تکتی رہیں
پاؤں ٹھیک کر	آنکھ کھلی	گھر چھوڑتے ہوئے
دروازے پر	اور اچانک	☆
وستک دے کر	خزان	
چلی گئی	آپڑی	



نظمیں

فردوں گیا وی
عارف نگر، گیا، بہار۔ موبائل: 9546037777

ڈاکٹر عالمدار عدم
جموں کشمیر اکیڈمی آف پلچر اینڈ لیناگو ہجڑ، راجوری، پونچھ

کیوں گھبرا گئے

فکر کی سلوٹیں
اُس کی پیشانی پتھیں
بال اس کے بھی
چاندی کے ہونے لگے
اب پہلی سی
اس کے چہرے پوہ شادابی نہیں
کل وہ پہاڑی ندی کی طرح شونخ تھی
آن وہ خاموش
گھری تی جھیل ہے
وقت نے میرے چہرے پتھی
ڈال دی جھری یاں
میں بھی سوچ کے گھرے سمندر میں تھا
خاموشی گھری جب ہو پہنچ
تب بڑے ہی سلیقے سے لب کھول کر
اس نے ہولے سے کہا
کیوں گھبرا گئے تم مجھے دیکھ کر
یہ تو ہونا ہی تھا
ایک وہ وقت تھا، ایک یہ وقت ہے

خواہش

تم میرے کیسے ہو مسیح
تم میرے کیسے ہو رہبر
مجھ کو اک نئی دے دو حیات
مجھ کو اک نئی بات سکھا دو
اور اک ایسی راہ دکھا دو
جس راہ پر میں چل نہ سکوں گر
میری آنے والی نسلیں
اس راہ سے کچھ حاصل کر لیں
اور مجھ کو آرام ملے گا
میں آرام سے مرتوں سکوں گا
میری ہے اتنی سی خواہش
میری خواہش پوری کر دو



نظم

مصدق اعظمی

اعظم گلہ، اتر پردیش - موبائل: 9451431700

سکون

اپنی تہائیوں کے چہرے پر غازہ شعر بھی ملائیں نے جس کی خوبی فضای میں مہکتی تھی اس مہک کی دیزیر چادر سے سر سے پاؤں تک چھپا یا تھا خود کو وہ بھی اک دن تھا اتنی مشکل میں اپنے پہلو میں اس کے ہونے کے مجھ کو احساس نے رلا�ا تھا	اپنی غربت کی ایک شب مجھ کو یاد ہے کس طرح گزاری تھی میں نے گلی زمین پہ سوکر چاند پانے کی آرزو کی تھی جگبگاتے ہوئے ستاروں میں اپنے تقدیر کے ستارے کو ڈھونڈھنے کی ہزار کوشش تھی رات کے گھنے اندر ہیرے میں زلفِ جاناں کی یاد آتے ہی
--	--

☆